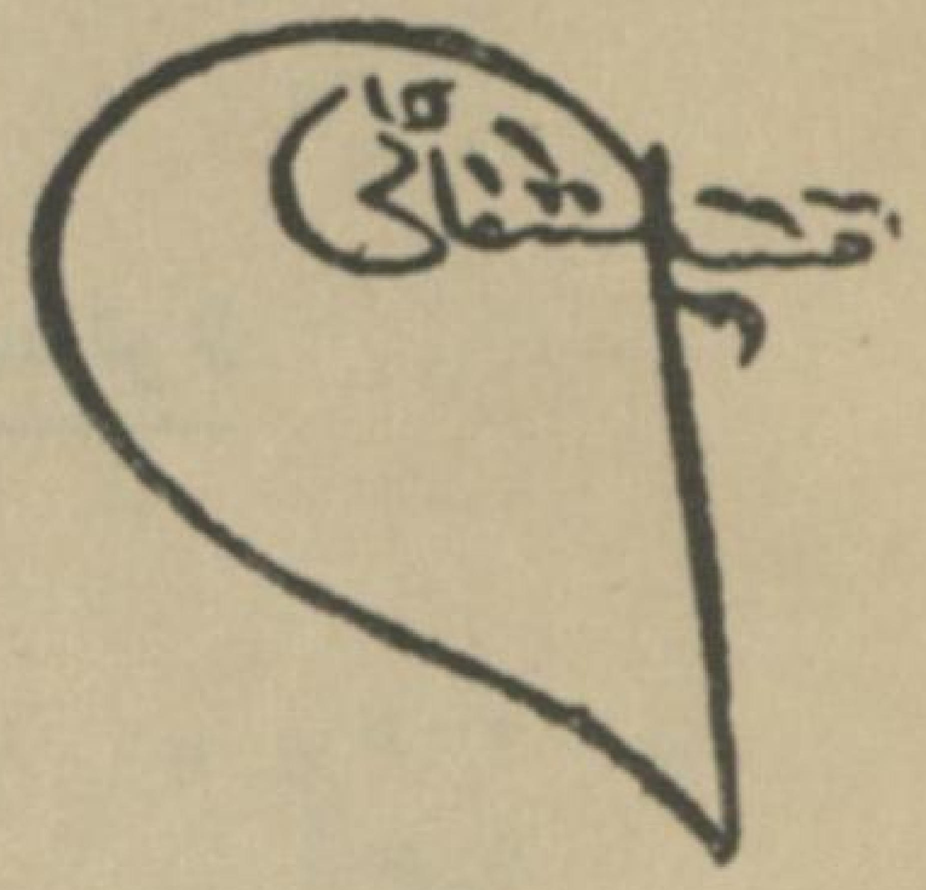
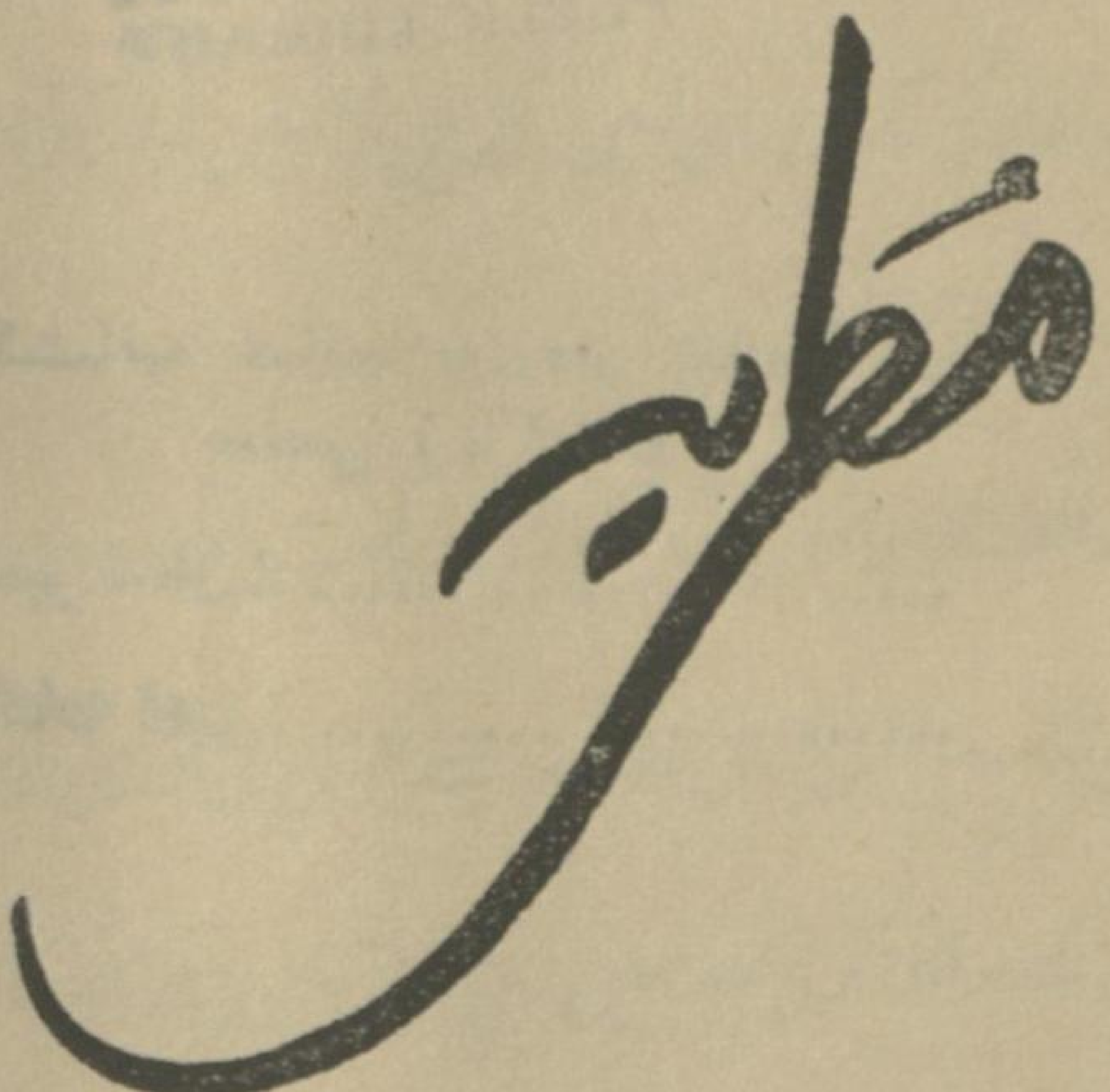

مطربہ
قتیل شفائی

مطهر





گوشۂ ادب ☆ چوک انارکلی ☆ لاہور

بار چہارم ... ۱۹۷۵ء

ناشر : ملک مبارک علی ۔ گوشۂ ادب ۔ لاہور

مطبع : نثار آرٹ پریس لمیٹڈ گلبرگ ۔ لاہور

قیمت بارہ روپے

یہ نظمیں

"مطربہ" میری اُن تخلیقات کے مجموعے کا نام ہے جو میں نے اپنی حیاتِ آوارگی کے دوران کہیں۔ اگر میں یہ نظمیں نہ کہتا تو اپنے فن سے شدید بددیانتی کا مرتکب ہوتا۔

طوائف کا موضوع نیا نہیں۔ دمودر گپت کی تصنیف سے لے کر میری اِن نظموں تک ہزاروں سال کا فاصلہ ہے لیکن پرانی اور نئی طوائفیں کوٹھے اَور کوٹھی کے سوا اَور کوئی بُعد نہیں۔ وہی تماشبین پر مَر مِٹنے کا ڈھونگ۔ وہی نائکہ کا مصنوعی جلال، وہی ماہانہ خرچے اور فرمائشیں —— جو کچھ کل تھا وہی آج بھی ہے۔ اِس لیے میں یہ دعوےٰ تو نہیں کر سکتا کہ میں نے کسی اچھوتی چیز کو ہاتھ لگایا ہے لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ صرف

میں ہی کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ میں نے یہ سب کچھ تماشائی بن کے نہیں بلکہ تماشا بن کے حاصل کیا ہے۔ اور یہ میرا کمال ہے کہ میں نے اُن لمحوں میں بھی "تجربہ نگاری" سے غفلت نہیں برتی۔ جب ایک مشّاق طوائف کا مصنوعی پیار انسان کی سوچ کو اندھا کر دیتا ہے۔ یہ وضاحت اس لیے ہے کہ "لیلٰے کے خطوط" جیسی تجربے اور مشاہدے سے خالی رومینٹک کتابیں پڑھ پڑھ کر گمراہ ہو جانے والے اذہان کہیں میری ان نظموں کو کسی انتقامی جذبے کی پیداوار نہ سمجھ بیٹھیں۔ ایسی بہت کم نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں جو طوفان گذر جانے کے بعد قلمبند ہوئیں۔

میں جانتا ہوں کہ بڑے بڑے انشا پرداز طوائف کے بارے میں لکھ لکھ کر ہار گئے پھر بھی یہ جنس بازار میں موجود رہی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جب تک کوئی نیا معاشی نظام نہیں آجاتا تب تک نغموں کی اوٹ میں جسم بکتے ہی رہیں گے۔ اس کے باوجود میں اپنی یہ نظمیں پیش کر رہا ہوں۔ اصلاحِ معاشرہ کی غرض سے نہیں بلکہ اچھے ادب کے طور پر ——— یہ نظمیں کچھ عرصہ پہلے میرے جذبات کی ملکیت تھیں لیکن اب یہ میرے فن کی امانت ہیں جو میں اپنے پڑھنے والوں تک پہنچا رہا ہوں۔

قتیل شفائی

فہرست

عمر پوشی ، ۹

چکلے ، ۱۰

نائیکہ ، ۱۲

تماشبین ، ۱۴

ٹریجڈی ، ۱۷

معصوم ، ۱۸

اندیشہ ، ۲۰

رسمِ شبستانِ طرب ، ۲۲

انوکھی ، ۲۵

سانولی سی اک عورت ، ۲۷

نیا چاند، نئی عید ، ۳۱

اے مری جانِ طرب ، ۳۳

گلاب کے پھول ، ۳۶

اوقاف ایکٹ ، ۳۸

تیرے خطوں کی خوشبو ، ۴۲

مطربہ ، ۴۵

اندیشہ ہائے دور دراز ، ۴۹

دوہری قیامت ، ۵۱

شعر اور موسیقی ، ۵۲

فرماں بردار ، ۵۵

سترھواں سنگار ، ۵۷

فنکار ، ۵۹

بھول ، ۶۱

مجبوری ، ۶۴

غزل ، ۶۶

لمحوں کی پرستار ، ۶۸

میری طرح ، ۷۱

منزل بہ منزل ، ۷۲

انوکھی عید ، ۷۴

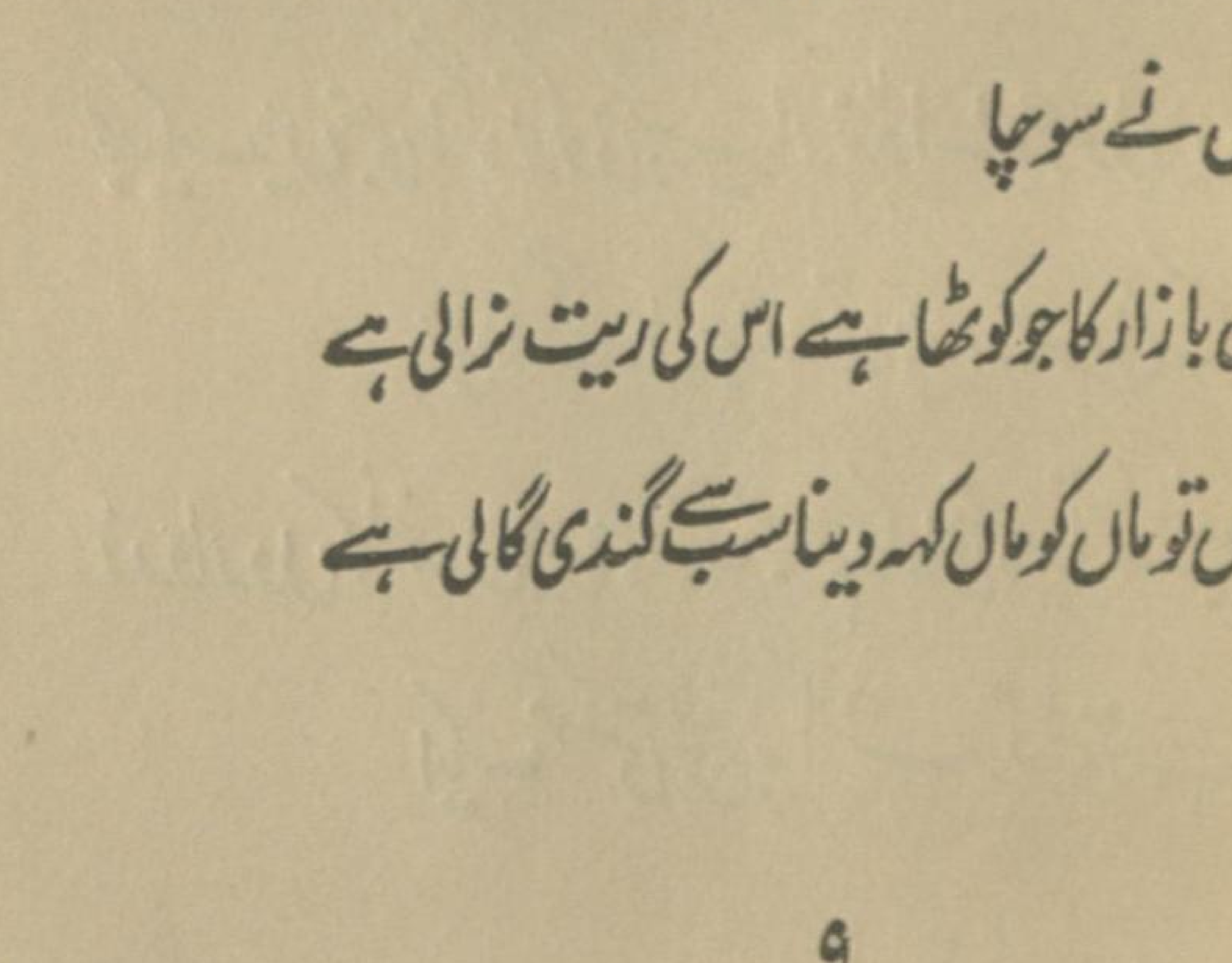
کس کے لیے ، ۷۷

ننھی، مُنّے اور گھگے کے نام۔

جو اپنی ماں کو باجی کہنے پر مجبور ہیں

عُمر پوشی

میں نے پوچھا
مُنّے! تم کیوں اپنی امّی جان کو باجی کہتے ہو
مُنّا بولا
باجی بھی تو نانی جی کو آپا آپا کہتی ہیں
میں نے سوچا
اس بازار کا جو کوٹھا ہے اس کی ریت نرالی ہے
یہاں تو ماں کو ماں کہہ دینا سب سے گندی گالی ہے



چکلے

رات گئے تک گھایل نغمے کرتے ہیں اعلان یہاں
یہ دُنیا ہے سنگدلوں کی کوئی نہیں انسان یہاں

عزّت والوں کی ذِلّت کا سب سے بڑا بازار ہے یہ
چُکتے ہیں غیرت کے سودے، بِکتے ہیں ایمان یہاں

بھیک میں بھی مانگو تو کوئی پیار نہ ڈالے جھولی میں
بِن مانگے مل جاتے ہیں رسوائی کے سامان یہاں

زرداروں کو نغموں میں جب جسم دکھائی دیتا ہے
ایک مہکتی سیج پہ اکثر ٹوٹتی ہے ہر تان یہاں



ممتا کے ہونٹوں پر جب چاندی کی مُہریں لگتی ہیں
ماں خُود اپنی بیٹی کو کر دیتی ہے قربان یہاں

اپنا خُون ہی بڑھ کر اپنے خُون کی بولی دیتا ہے
کِس نے کِس پر ہاتھ بڑھایا کوئی نہیں پہچان یہاں

پاپ کے اس مندر میں کیا کیا بھاؤ بتائے رام جنی
شام ڈھلے جب آن براجیں سونے کے بھگوان یہاں

رات گئے تک جاگے سانوری کالے چوروں کی خاطر
اور اگر انکار کرے کہلائے نافرمان یہاں

جھلمل کرتی پوشاکوں سے چاہے بدبُو آتی ہو
خود جل کر محفل کو خوشبو دیتا ہے لوبان یہاں





نائکہ

دیکھ بٹیا یہ ترے ہی فائدے کی بات ہے

دیکھ جھٹلایا نہیں کرتے بڑے بوڑھوں کی بات

تو نہ مانے گی تو اس بازی میں کھا جائے گی مات

واری جاؤں یہ جہاں جو کچھ بھی کہتا ہے کہے

تجھ میں کوئی عیب ہے جو ایک کی ہو کر رہے؟

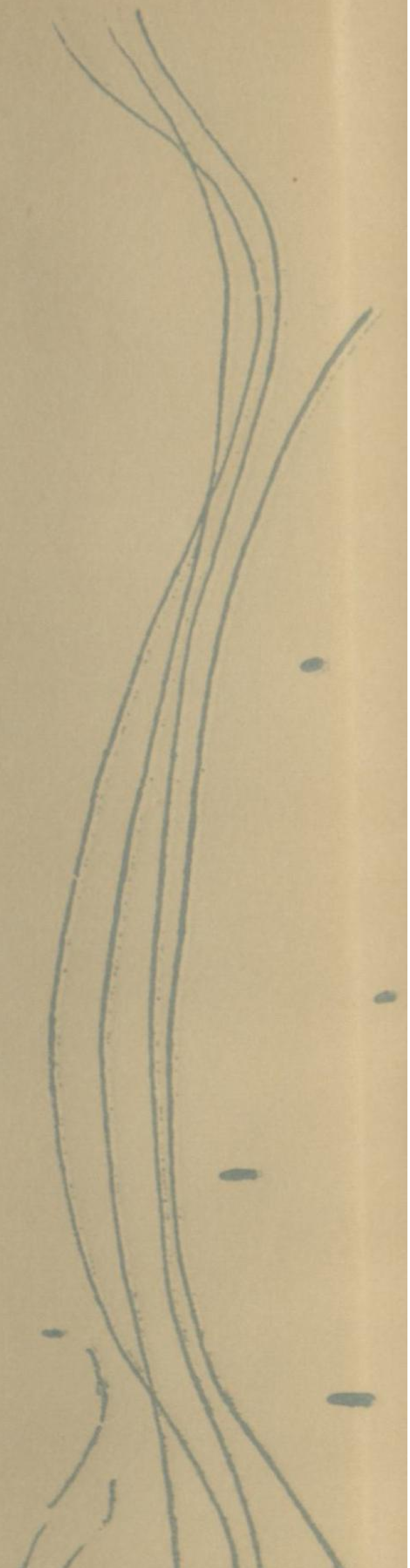
اس طرح محدود ہو جانے سے تو انکار کر

جو بھی اپنی جیب کھنکائے اسی سے پیار کر



پیار کر اُس سے جو تیری چاہ میں غرقاب ہو
چاہے وہ کنجڑا ہو، نیلاری ہو یا قصاب ہو
تیری پرنانی خدا بخشے، بڑی ہشیار تھیں
ایک دو کیا وہ تو سارے شہر کی دلدار تھیں
پھر بھی لیکن آرزوئے راہِ آزادی نہ کی
اُن بہشتن نے تو مرتے دم تلک شادی نہ کی
تیرے دل میں ہے اگر کچھ اپنے بچّوں کا خیال
اپنے پیشے کو وفاداری کے جھنجھٹ میں نہ ڈال
دیکھ بٹیا یہ ترے ہی فائدے کی بات ہے







تماشبین

آج تک میں نے تجھے دیکھا نہیں لیکن یہ کیا

جب بھی چاہوں، جس طرح چاہوں، جہاں بھی چاہوں میں

تیرے خدّ و خال، تیری چال، تیری گفتگو

دیکھ سکتا ہوں، بتا سکتا ہوں، سُن سکتا ہوں میں

تیرا جیتا جاگتا سایا ہے میرے سامنے



یہ ترا سایا، یہ تیرے جسم کی گمنام بھول
جب کبھی میں نے اِسے دیکھا تری یاد آ گئی
اور جب اِس یاد کی چلمن سے دیکھا جھانک کر
میری آنکھوں میں تری وہ زندگی لہرا گئی
وقت جس کو کھینچ کر لایا ہے میرے سامنے

دیکھ میرے سامنے ہے وہ ترا جُرمِ نہاں،
جو عیاں کرتا رہے گا تیرے خدّ و خال کو
تو چھپا سکتا نہیں اَب اپنے چہرے کے نقوش
مِل گیا اِک جسم، اِک پیکر ترے اعمال کو
اِک نئے پیکر میں تو آیا ہے میرے سامنے

دیکھتا ہوں میں تجھے اُس بچپنے کی شکل میں
جو کسی کی بھی نظر میں پیار کے قابل نہیں



بھول بیٹھا ہے جسے تو اپنے ماضی کی طرح
اِس بھری دنیا میں جس کا کوئی مستقبل نہیں،
تیری خوش ذوقی کا سرمایا ہے میرے سامنے

تیری خوش ذوقی کا سرمایا، یہ اِک نورَس کلی
کمسنی میں بھی ہے اس پر کتنے بھنوروں کی نظر
جس طرح تو نے خریدا تھا کسی کے جسم کو
دے گا بولی اس کی بھی اِک روز کوئی اہلِ زر
ایک بادل دُور تک چھایا ہے میرے سامنے





ٹریجڈی

میں اِک ایسی دُلہن کو جانتا ہوں
جس کی ڈولی نہیں اُٹھی اَب تک
جس نے دیکھے نہیں کہار ابھی
جس کو چھیڑا نہیں ہے سکھیوں نے
جس سے ڈرتا ہے پی کا دوار ابھی
میں اِک ایسی دُلہن کو جانتا ہوں
کوئی بابل نہ جس کی ساس نند
جس کا غیروں کے ساتھ جی بہلے
بن چکی ہے جو ماں یتیموں کی
رخصتی کی رسُوم سے پہلے
میں اِک ایسی دُلہن کو جانتا ہُوں



معصوم

امّی پیاری پیاری امّی
یہ تو مجھے بتلا دو نا
تم میری کیا لگتی ہو؟

پوچھتے ہیں میرے ہمجولی
جب میں اُن سے کھیلتا ہُوں
تیرے باپ کا نام ہے کیا؟



میں کہتا ہوں امّی سے کل پُوچھ کے تمھیں بتادوں گا
لیکن پیاری امّی مجھ کو اتنا بھی معلوم نہیں
تم میری کیا لگتی ہو ——؟
ماں ہوتیں تو مجھ کو تنہا چھوڑ کے لمبی راتوں میں
دیر دیر تک مجھ سے دُور نہ تم رہتیں
پھر تم میری کیا ہو امّی
اتنا تو سمجھا دو نا
باپ کا نام تو پھر مجھ کو بتلا دینا
تم میری کیا لگتی ہو —؟
یہ تو مجھے بتلا دو نا
پیاری امّی
بے حس امّی ——!



اندیشہ

صندلیں جسم کی خوشبو سے مہکتی ہُوئی رات
مجھ سے کہتی ہے یہیں آج بسیرا کرلے
گر تری نیند اُجالوں کی پرستار نہیں
اپنے احساس پہ زُلفوں کا اندھیرا کرلے

میں کہ دن بھر کی چکاچوند سے اُکتایا ہُوا
کسی غنچے کی طرح دُھوپ میں کملایا ہُوا
اِک نئی چھاؤں میں سستانے کو آبیٹھا ہُوں
گردشِ دہر کے آلام سے گھبرایا ہُوا
سوچتا ہوں کہ یہیں آج بسیرا کرلوں



صُبح کے ساتھ کڑی دُھوپ کھڑی ہے سر پر
کیوں نہ اس ابر کو کچھ اَور گھنیرا کر لُوں
جانے یہ رات اکیلے میں کٹے یا نہ کٹے
کیوں نہ کچھ دیر شبستاں میں اندھیرا کر لُوں

لیکن اِس رات کی یہ بات نہ بڑھ جائے کہیں
تُجھ سے مِل کر یہ مرے دل کو لگا ہے دھڑکا
راکھ ہو جاؤں گا مَیں صُبح سے پہلے پہلے
کُھل کے سینے میں جو احساس کا شعلہ بھڑکا





رسمِ شبستانِ طرب

کون یہ اُن کے شبستاں میں چھُپا بیٹھا ہے
کوئی فاتح ہے مگر دِل میں ہے گھبرایا ہُوا
اُس نے جس لشکرِ جرّار پہ کی تھی یلغار
اُس نے پھر پرچمِ زرکار ہے لہرایا ہُوا

دُور تا حدِّ نظر کوئی بھی اپنا تو نہیں
ایک پرچم کے تلے جمع ہیں سارے اغیار
مقصدِ جنگ یہاں سب کا جُدا ہے لیکن
سب کے ہاتھوں میں چمکتی ہے سُنہری تلوار



وسوسے دل میں لیے سوچ رہا ہے فاتح،
کس طرح مملکتِ حُسن رہے زیرِ نگیں
چند راتوں کی حکومت کا یہ بے کار غرُور
چیختی رُوح کی تسکین کا ضامن تو نہیں

اِس سے پہلے بھی تو آئے ہیں کئی لوگ یہاں
حُسن اور حُسن کی سرکار پہ قابُو پانے
فتح کے بعد بھی لیکن اُنھیں تسکیں نہ ملی
آخرِ کار تہہ تیغ ہُوئے دیوانے

فاتحِ حُسن کئی دن سے اسی سوچ میں ہے
اس کی بھی موت کا پیغام نہ آ پہنچا ہو
کسی قارُون کی دولت کے خزانوں کے عوض
اُس کی تذلیل کا ہنگام نہ آ پہنچا ہو



آہٹیں تیز ہُوئیں خوف نے گھیرے ڈالے
تھرتھراتے ہیں شبستاں کے پُراسرار دِیے
سر پہ آ پہنچا ہے شاید کوئی خُونخوار غنیم
ہاتھ میں زر کی چمکتی ہُوئی تلوار لیے
دو خبر مملکتِ حُسن کے دربانوں کو
اب اُجالوں کے بھی چہروں پہ سیاہی ہوگی
دفن ہو جائے گا یادوں میں پُرانا فاتح
اب یہاں اَور کسی اَور کی شاہی ہوگی





انوکھی

وہ عجیب عورت ہے

اُس کے دلربا نغمے — چار سُو بکھرتے ہیں
لوگ اُس کے نغموں کی — دلکشی پہ مرتے ہیں
کچھ تو قدرداں بن کر — اُس کی جیب بھرتے ہیں
کچھ اُسے لبھانے کو — بے طرح سنْورتے ہیں
اور کچھ امارت ــــــ کی — راہ سے اُبھرتے ہیں
بیویوں سے چھپ چھپ کر — عرضِ شوق کرتے ہیں



ساغروں کی حدت سے جب کبھی نکھرتے ہیں
پیار بھی جتاتے ہیں تہمتیں بھی دھرتے ہیں
جو نہ زیب دے اُن کو وہ بھی کر گزرتے ہیں
اُس کے زمزمے لیکن سب سے پیار کرتے ہیں
سب کی بھول پر اس کے قہقہے بکھرتے ہیں
منزلوں پہ سب اُس کا اِنتظار کرتے ہیں

وہ عجیب عورت ہے





سانولی سی اِک عورت

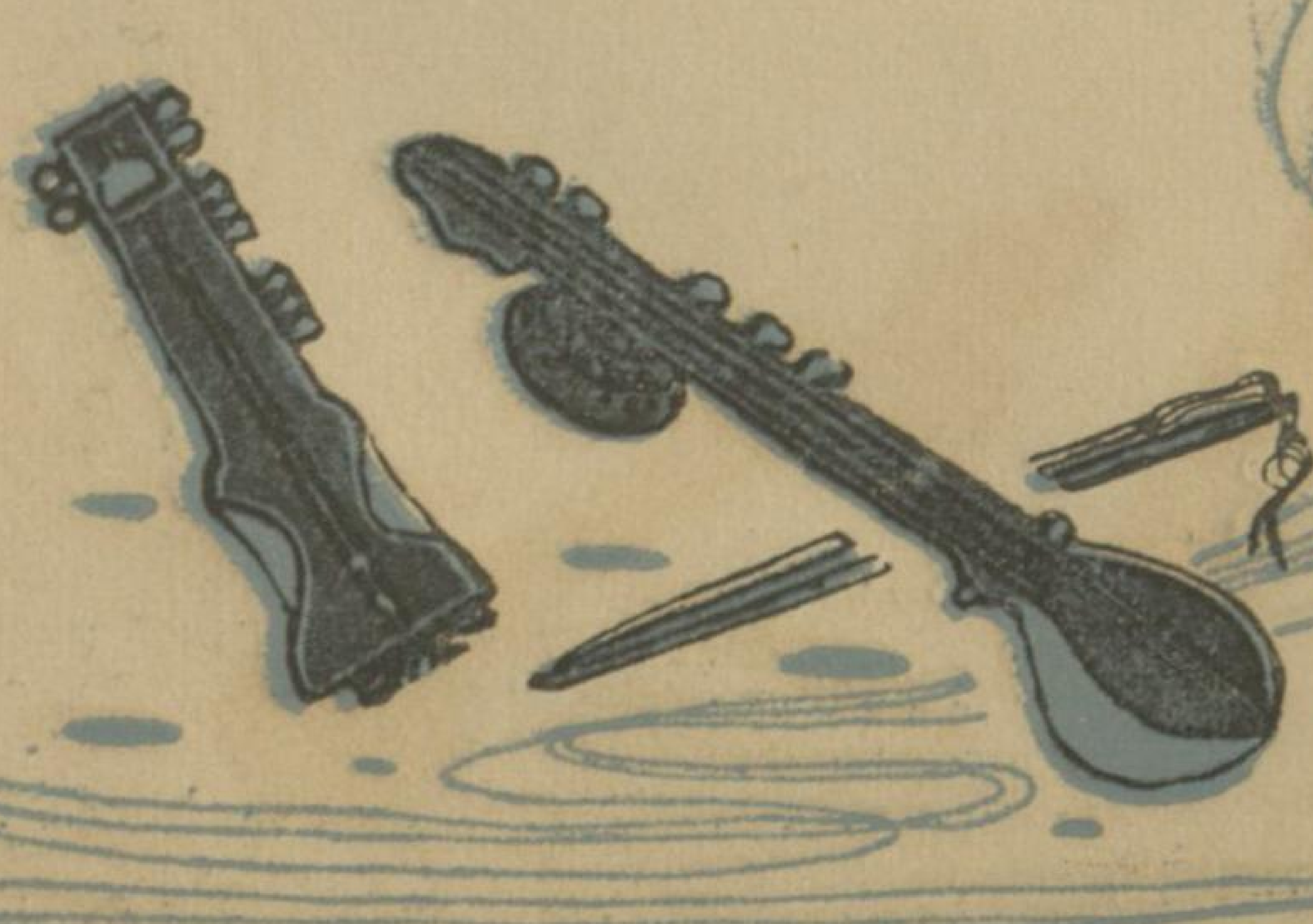
بھیج رہی ہے اب تک مجھ کو چاہت کے پیغام
سانولی سی اِک عورت جس کا مردوں جیسا نام

وہ عورت جس کے ہونٹوں پر ناچیں میرے گیت
جس کی بڑھتی شہرت کو، میں سمجھوں اپنی جیت
سب دُنیا کو چھوڑ کے جس نے مجھے بنایا مِیت
سنتا ہوں دن رات میں جس کی سانسوں کا سنگیت
چھائے میرے ذہن پہ اکثر بن بن کر الہام
سانولی سی اِک عورت جس کا مردوں جیسا نام



اُبھرے اُبھرے ہونٹ ہیں اُس کے کھلتے سُرخ گلاب
اُس کی رنگت مستقبل کا دُھندلا دُھندلا خواب
اُس کے نغموں کی لَے پر بہتا ہے مَست چناب
اُس کی چال چکوروں جیسی اُس کا بدن کمخواب
پیاس بھڑکتی ہے جب میری بن جاتی ہے جام
سانولی سی اِک عورت جس کا مردوں جیسا نام

میں جب اُس کا ذکر کروں تو چونک پڑیں سب لوگ
کوئی نصیحت کرے مجھے اور کوئی منائے سوگ
دیکھ سکا ہے کب کوئی دو رُوحوں کا سنجوگ
اُس بے چاری کو سب جانیں میری جان کا روگ
میری خاطر سہتی ہے سب دُنیا کے دُشنام
سانولی سی اِک عورت جس کا مردوں جیسا نام



میں کہتا ہوں اِن لوگوں سے چھوڑو پچھلی بات
اپنے پیار سے میں نے اُس کے بدل دیے دن رات
دولت والے اُسے خریدیں؟ کیا اُن کی اوقات
برسے گی اب میرے ہی آنگن میں یہ برسات
میری ہی چاہت کا لے گی اپنے سر الزام
سانوّلی سی اِک عورت جس کا مردوں جیسا نام

چھوڑ کے عصمت کی منڈی اور جسموں کا بازار
پیش کرے اونچے محلوں میں وہ فن کے شہکار
مان لیا ہے سب نے اُس کو اک سچّی فن کار
زیب نہیں دیتا اب اُس کو وہ گنّدا بیوپار
اوروں کی مانند بھلا کب ہوتی ہے نیلام
سانوّلی سی اِک عورت جس کا مردوں جیسا نام



مان لیا کچھ اور تھی پہلے اس کے پیار کی ریت
ایک ہی سُر پر کبھی نہ قائم تھا اُس کا سنگیت
پھر بھی سب کچھ چھوڑ کے اُس نے مجھے بنایا میت
جب تک وہ چاہے گی اندھے رہیں گے میرے گیت
اپنے ساتھ لیے پھرتی ہے وہ میرا انجام
سانولی سی اِک عورت جس کا مردوں جیسا نام





نیا چاند، نئی عید

اے مری شمعِ شبستانِ طرب — چھیڑ دے پھر سے کوئی سازِ نوید
سُن چکے لوگ بہت گیت ترے — اَب مجھے بخش دے اِک نغمۂ عید

مُجھ سے پہلے یہ تری بزمِ نشاط — اہلِ ثروت کا اجارہ ہی تو تھی
جس کو دیکھیں فقط اربابِ ہوس — تو وہ دُھندلا سا نظارہ ہی تو تھی

میں نے بخشا ہے ترے نغموں کو — آبرُومندِ مغنّی کا غرور
میں نے بیدار کیا دل میں ترے — حُرمتِ فن کی بلندی کا شعُور

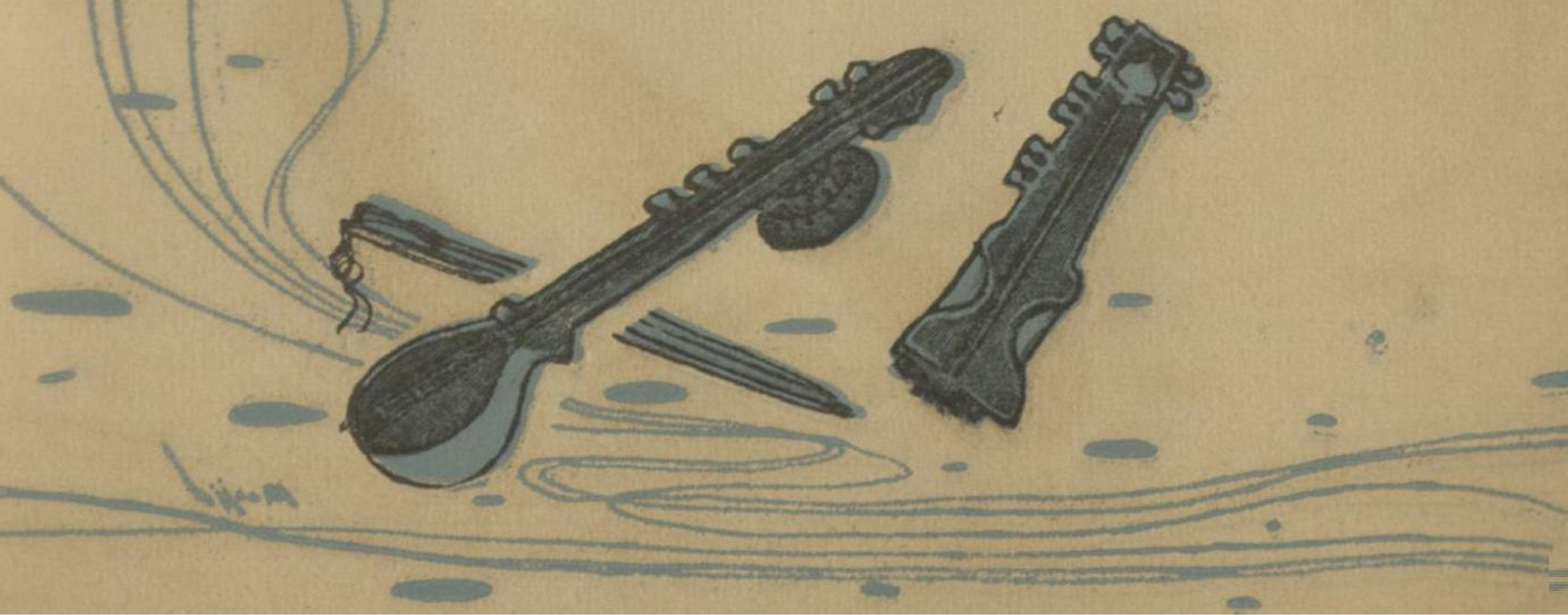


ورنہ آتے تھے سرِ بزمِ نشاط — بن کے فرعون کے ہمسر کچھ لوگ
کالے بازار سے لُوٹا ہُوا مال — تجھ پہ کرتے تھے نچھاور کچھ لوگ

آج لیکن کسی مجبُوری سے — کوئی نغمہ ترا محدُود نہیں
لُوٹ لیں جو ترے فن کی حُرمت — اب وہ رہزن کہیں موجُود نہیں۔

دیکھ نکلا ہے وہ پھر عید کا چاند — پھر نکھرنے کو ہے رعنائیِ شب
آ تجھے رُوح میں روشن کر لوں
اے مری شمعِ شبستانِ طرب





اے مِری جانِ طرب

خیال تھا کہ تجھے بھُول جاؤں گا میں بھی
کیے ہزار جتن پر تجھے بھُلا نہ سکا
سُنا تھا لوگ کھلونا تجھے سمجھتے ہیں
مگر میں اپنی نظر سے تجھے گرا نہ سکا
سُنائے لاکھ رقیبوں نے تیرے افسانے
مگر کبھی مرا احساس ڈگمگا نہ سکا



مجھے خبر ہے کہ ہر شام تیرے ہونٹوں نے
ہزار گیت بکھیرے ہیں اہلِ زر کے لیے
مجھے خبر ہے کہ مہکا ہُوا بدن تیرا
بنا ہے دعوتِ نظّارہ ہر نظر کے لیے
بُرا نہ مانے تو کہہ دوں خُدا کے گھر کی طرح
کھُلا رہا ہے ترا در بھی ہر بشر کے لیے

ترے حریمِ طرب میں ہوس کے سوداگر
بنامِ نغمہ و فن تجھ سے بارہا کھیلے
ردائے زر میں چھپا کر ذلالتوں کے جذام
ملے ہیں تجھ سے کئی بدقماش البیلے
تجھے بھی زر کی طلب تھی ترے بھی جلووں نے
لگا دیے سرِ بازار پیار کے میلے



مجھے خبر ہے کہ میں وہ رئیسِ شہر نہیں
کہ جس کی جیب میں دولت کھنکتی رہتی ہے
وہ جس کے حجلۂ عشرت کی بے طلب اولاد
خود اپنے باپ کے دل میں کھٹکتی رہتی ہے
وہ جس کی دولت و ثروت غلیظ کوٹھوں پر
خبیث روحوں کی صورت بھٹکتی رہتی ہے

اگر میں ایسا ہی ہوتا کوئی رئیس تو پھر
ترے خیال کو دل سے بھلا بھی سکتا تھا
براہِ عشرت و ثروت جو تو ملی ہوتی
تجھے میں اپنی نظر سے گرا بھی سکتا تھا
تری نظر میں جو ہوتا نہ خوابِ مستقبل
تو میں وفا کو تماشہ بنا بھی سکتا تھا



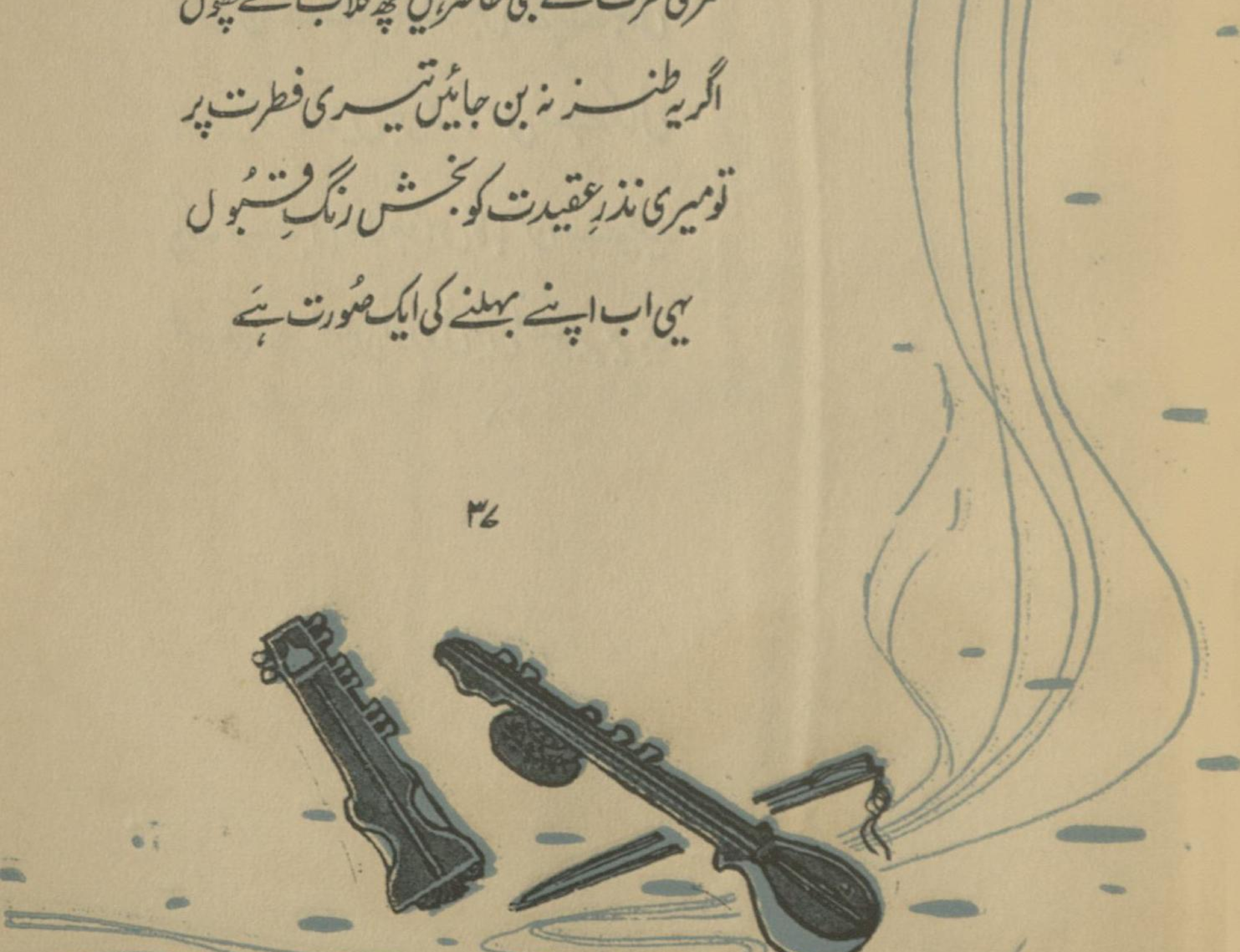
گلاب کے پھُول

تجھے گلاب کے پھُولوں سے کیوں نہ ہو رغبت
کہ اُن سے آتی ہے خوشبو ترے بدن کی سی
ملا ہے رنگ انھیں تیرے پیرہن کا سا
عطا ہوئی ہے انہیں چھب کسی دُلہن کی سی
وہی دُلہن کہ ہر اک من میں جس کی مُورت ہے



تجھے گلاب کے پھولوں سے یوں بھی ہے اُلفت
کہ وہ بھی صرف بہاروں کا ساتھ دیتے ہیں
خزاں رسیدہ چمن میں اگر صبا نہ رہے
تو بس وہ اپنے ہی خاروں کا ساتھ دیتے ہیں
انھیں کسی سے نبھانے کی کیا ضرورت ہے

تیرے مزاج کی بے مہریوں کو مہکانے
مری طرف سے بھی حاضر ہیں کچھ گلاب کے پھول
اگر یہ طنز نہ بن جائیں تیری فطرت پر
تو میری نذرِ عقیدت کو بخش رنگِ قبول
یہی اب اپنے بہلنے کی ایک صورت ہے

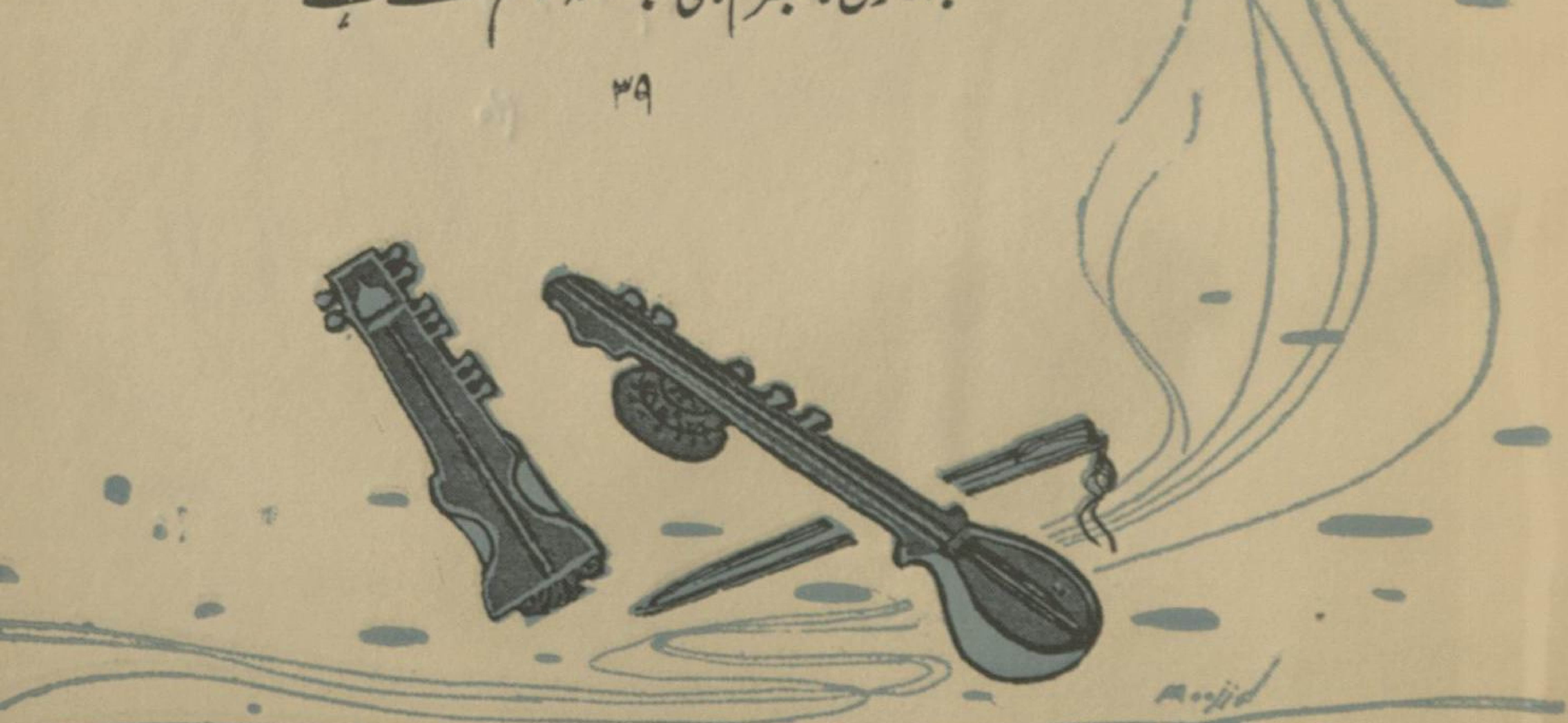


اوقاف ایکٹ

رقص کر اے مطربہ! چھم چھم چھما چھم رقص کر
بارگاہِ مرشدِ کامل میں پیہم رقص کر
رقص کر ہاں رقص، اس بہروپیے کے رُوبرُو
رُشد کا بہروپ بھر رکھا ہے جس نے مُو بہ مُو
مکر و فن سے ہے عبارت جس کے چہرے کا جلال
جاہلوں کو لُوٹنے میں جس کو حاصل ہے کمال
پاک تر ہے جس کا ظاہر، جس کا باطن ہے پلید
لب پہ توقیرِ حسینؓ اور دل میں تصویرِ یزید



عصمتیں لُٹتی ہیں اَب بھی جس کی عشرت گاہ میں
خوبصورت جسم بِچھ جاتے ہیں جس کی راہ میں
خلوتوں میں جس کو ہے مرعوب شغلِ نائے نوش
مہرباں تجھ پر ہُوا ہے آج وہ تربت فروش
تو اُسی مجذوب کے آگے دمادم رقص کر،
رقص کر اے مطربہ! چھم چھم چھما چھم رقص کر
عیش و عشرت، جاہ و حشمت، مال و زر، دُنیا و دیں
آج اِس محفل میں تیرے واسطے کیا کچھ نہیں
دیکھ یہ ہے بارگاہِ مُرشدِ عالی مقام
ہو چکی ہے آج پھر جس کی طہارت بے لگام
حرص کی سب گرم بازاری اسی کے دم سے ہے
قحبہ خانوں کا بھرم بھی قبلۂ عالم سے ہے



شیطنت کا رنگ کس شدت سے غالب آگیا
تیرے قدموں میں ترے جلووں کا طالب آگیا
جذب کے عالم میں وہ کچھ تجھ سے فرمانے کو ہے
ایک رہزن تیرے ہاتھوں آج لُٹ جانے کو ہے

لُوٹ کر اس راہزن کو جانِ عالم رقص کر
رقص کر اے مطربہ! چھم چھم چھما چھم رقص کر

مطربہ! اندھی عقیدت کا صنم خانہ ہے یہ
ذبح ہوتا ہے جہاں مذہب وہ کاشانہ ہے یہ
رات دن ایمان کی گردن پہ چلتی ہے چھُری
تو یہاں پائے گی ہر قصّاب کی نیّت بُری
بوٹیاں تک نوچ لینے کو سبھی تیّار ہیں
جس قدر درویش ہیں اِس بزم میں عیّار ہیں



لُوٹتے ہیں مال یہ جِتنا خدُا کے نام پر
سب لٹا دیتے ہیں آخر گیسوؤں کی شام پر
لیکن اب یہ گیسوؤں کی شام ڈھل جانے کو ہے
اک چھری اِن کے کلیجے پر بھی چل جانے کو ہے

اَب یہ محفل بن رہی ہے بزمِ ماتم، رقص کر
رقص کر اے مطربہ! چھم چھم چھما چھم رقص کر





تیرے خطوں کی خوشبو

تیرے خطوں کی خوشبو ——

ہاتھوں میں بس گئی ہے سانسوں میں رچ رہی ہے

خوابوں کی وسعتوں میں اک دُھوم مچ رہی ہے

جذبات کے گلستاں مہکا رہی ہے ہر سُو

تیرے خطوں کی خوشبو ——

تیرے خطوں کی مجھ پر کیا کیا عنایتیں ہیں

بے مدّعا کرم ہے، بے جا شکایتیں ہیں



اپنے ہی قہقہوں پر برسا رہی ہے آنسو
تیرے خطوں کی خوشبو ——

تیری زبان بن کر اکثر مجھے سُنائے
باتیں بنی بنائی ، جُملے رٹے رٹائے
مجھ پر بھی کر چکی ہے اپنی وفا کا جادُو
تیرے خطوں کی خوشبُو ——

سمجھے ہیں کچھ اسی نے آداب چاہتوں کے
سب کے لیے وہی ہیں القاب چاہتوں کے
سب کے لیے برابر پھیلا رہی ہے بازُو
تیرے خطوں کی خوشبُو ——



اپنے سوا کسی کو میں جانتا نہیں تھا
سنتا تھا لاکھ باتیں اور مانتا نہیں تھا
اب خود نکال لائی بیگانگی کے پہلُو
تیرے خطوں کی خوشبُو ——

کیا جانے کس طرف کو چپکے سے مُڑ چلی ہے
گلشن کے پَر لگا کر صحرا کو اُڑ چلی ہے
روکا ھزاریں نے آئی مگر نہ قابُو
تیرے خطوں کی خوشبُو ——





مطربہ

جسم کی آبرو جو ہُوئی سو ہُوئی ، رُوح کو اب نہ مجروح کر مطربہ!
کیوں بھکاری کے مانند پھر آجکل تیرے نغمات ہیں دربدر مطربہؑ!

تیرے ماحول کے نرم کشکول میں بھیک بن کر گریں گی ہوس کاریاں
تیرے حالات کے خُوشنما ہاتھ پر لوگ رکھ دیں گے چاندی کی چنگاریاں
تیرے انجام کی سانولی شام تک یوں تو ہوں گی تری خُوب دلداریاں
ڈوب جائے گی جب حُسن کی چاندنی تجھ سے کترائے گی ہر نظر مطربہ!
جسم کی آبرو جو ہُوئی سو ہُوئی رُوح کو اَب نہ مجرُوح کر مطربہ!



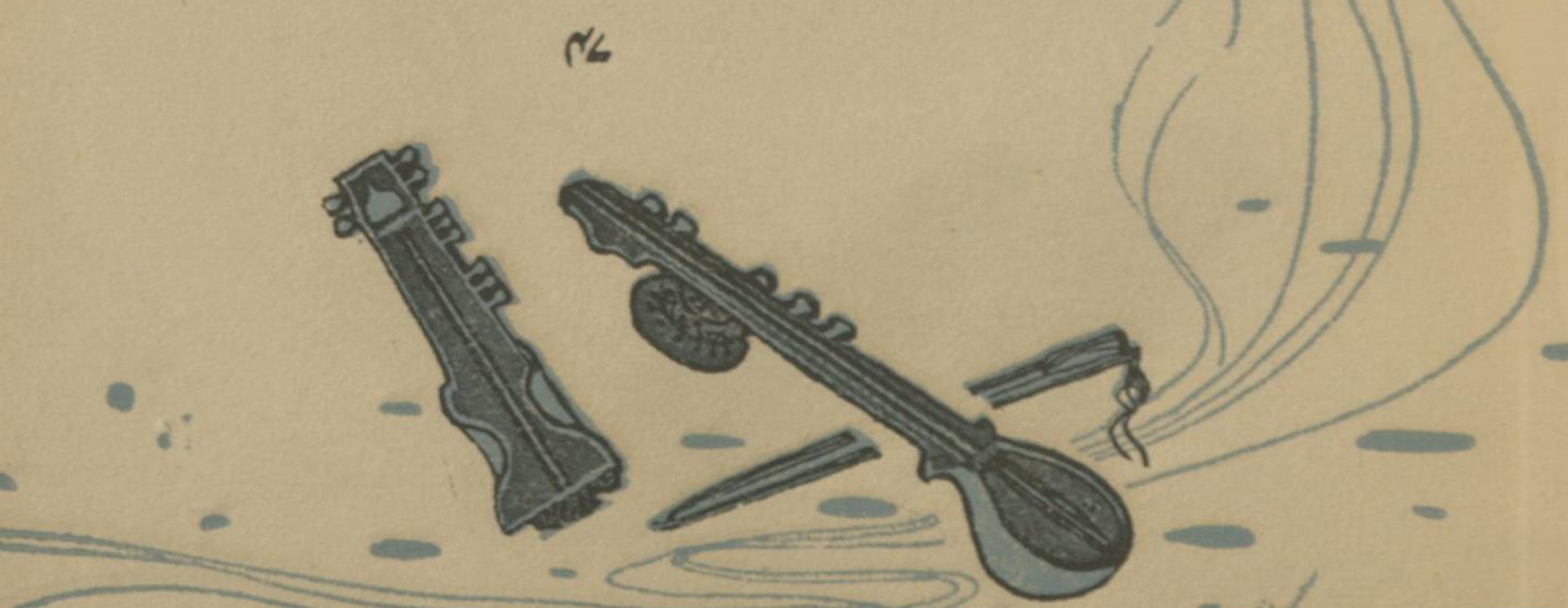
جانتا ہُوں کہ نغموں کی تاجر ہے تُو یہ تجارت بھی تجھ کو نہ راس آئے گی
دے گی آواز جب تُو خریدار کو تیرے لہجے سے زخموں کی باس آئے گی
مُسکراتی ہُوئی جائے گی تو جہاں لوٹ کر تو وہیں سے اُداس آئے گی
تیرے نغمات بے موت مر جائیں گے، قبر بن جائے گا تیرا گھر مطربہ!
جسم کی آبرو جو ہُوئی سو ہُوئی رُوح کو اَب نہ مجرُوح کر مطربہ!

ایک سے ایک بڑھ کر ترے شہر میں چیختی عصمتوں کا خریدار ہے
کوئی اُن میں ہے پروانۂ چشم و لب، کوئی دیوانۂ زُلف و رُخسار ہے
تیرے نامُوسِ فن سے اُنھیں کیا غرض جن کی نظروں میں تو جنسِ بازار ہے
سب کے مانند تجھ کو بھی معلوم ہے یہ لُٹاتے ہیں کیوں سیم و زر مطربہ!
جسم کی آبرو جو ہُوئی سو ہُوئی رُوح کو اَب نہ مجرُوح کر مطربہ!



تیرے چہرے پہ اب تک نہ سہرا بندھا تیرے ہاتھوں میں اب تک نہ مہندی رچی
شہر بھر کی ہے تو بن بیاہی دلہن بن بیاہے تری دھوم گھر گھر مچی
تو کبھی جاہلوں کو پسند آگئی تو کبھی احمقوں کی نظر میں جچی
تجھ کو فن کے پرستار بن کر ملے کتنے بے ذوق اور بے ہنر مطربہ!
جسم کی آبرو جو ہوئی سو ہوئی روح کو اب نہ مجروح کر مطربہ!

کھیتیوں سے چرائے ہوئے ہل بھی تھے کارخانوں سے لوٹا ہوا مال بھی
تیرے بدنام عشّاق لاتے رہے اپنے تحفوں کے ساتھ اپنے اعمال بھی
قوم کے ہمدموں کا تو کیا ذکر ہے ان میں شامل تھے مذہب کے دلّال بھی
ان شریفوں کی دلبستگی کے لیے تو کھلونا بنی عمر بھر مطربہ
جسم کی آبرو جو ہوئی سو ہوئی، روح کو اب نہ مجروح کر مطربہ!



اور تیرے اسی شہر میں وہ بھی ہیں جن کی تقدیر میں چاندی سونا نہیں
جن کی غیرت کے اُونچے محلّات میں کھردرا سا بھی کوئی بچھونا نہیں
وہ کھلونا سمجھتے ہیں تقدیر کو خود کسی کے لیے بھی کھلونا نہیں
کوئی زردار آئے تو وہ تھوک دیں اپنی عزّت نہ بیچیں مگر مطربہ!
جسم کی آبرو جو ہُوئی سو ہُوئی، رُوح کو اب نہ مجروح کر مطربہ!

اُف! مگر میں کہاں سے کہاں آگیا کون زردار کیسی ہوس کاریاں؟
کیا غرض اس سے مجھ کو دمکتی پھریں تیرے ہاتھوں پہ چاندی کی چنگاریاں
میں بہک سا گیا ہُوں وگرنہ مجھے خود بھی مرغوب ہیں تیری دلداریاں
میری باتوں سے اتنی پریشاں نہ ہو جانتے ہیں سب اہلِ نظر مطربہ!
کیوں بھکاری کے مانند پھر آجکل تیرے نغمات ہیں دربدر مطربہ!



اندیشہ ہائے دُور دراز

یہ جھومتی ہُوئی تیرے خلوت کدے کی شام
میں تیرے سامنے ہوں، مِرے سامنے ہے جام
وہ جام جس کی لوح پہ لکھّا ہے تیرا نام
کچھ سوچنے لگا ہُوں میں یہ جام دیکھ کر

یہ جام جس میں تُو نے بھری ہے شرابِ ناب
کیوں آج بن رہا ہے مری رُوح پر عذاب
لے کر بھی تیرے ہاتھ سے نذرانۂ شباب
تھرّا رہا ہُوں رُوح میں کہرام دیکھ کر



یہ جام مجھ پہ قہقہہ زن ہے کچھ اِس طرح
میں بھی کسی فریب کی زد میں ہوں جس طرح
حیراں ہوں کہ اَب اِسے جھٹلاؤں کِس طرح
میں اپنے پیشرؤں کا انجام دیکھ کر

وہ میرے پیشرو، وہ ترے طالبِ جمال
کرتے رہے ادا جو تِری قیمتِ وصال
یہ جام بھی انھیں کی نوازش کا ہے کمال
جو ہنس رہا ہے مجھ کو تہہِ دام دیکھ کر

میں سوچتا ہوں وہ مِرا مجموعۂ کلام
منسوب کر چکا ہوں جسے میں بھی تیرے نام
کیا جانے میرے بعد بسائے گا کس کی شام
مجھ کو اسیرِ گردشِ ایّام دیکھ کر



دوہری قیامت

ایک تو میرے لیے شمع بنی محفل میں
ایک چپ چاپ سُلگتی رہی دل ہی دل میں
جب نصیبوں پہ سیاہی چھائی
رات غموں کی آئی
مجھ پہ دونوں نے قیامت ڈھائی
ایک نے مجھ پہ ہنسایا ہے بھری محفل کو
ایک نے سوزِ ندامت دیا میرے دِل کو



شعر اور موسیقی

اِک افسرِ اعلیٰ نے
دو شاعر سے کہا صاحب!
یہ کام تو مُشکل ہے
پر آپ مِرے گھر پر
قلقل کی صداؤں میں
آکر مرے یاروں کو
بخشیں جو کلام اپنا



پھر آپ مجھے ہر دم
پائیں گے غلام اپنا'
اور شاعرِ آوارہ
اس شرطِ مروّت کو
ٹھکرا کے چلا آیا

اِک افسرِ اعلیٰ نے
فرمایا طوائف سے
"یہ کام تو مشکل ہے
پر آپ مرے گھر پہ
آ کر مری خلوت کو



بخشیں جو قیام اپنا
پھر آپ مجھے ہردم
پائیں گی غلام اپنا"
دل جھوم اُٹھا اس کا
اس حکمِ رذالت پر
اور دل میں طوائف کے
گھنگھرو سے چھنک اُٹھے





فرماں بردار

نہ تو ہیرے کی انگوٹھی ہے نہ سونے کی گھڑی
ایسی حالت میں بھلا کام چلے گا کیوں کر
یہ بجا ہے کہ سمگلنگ کا وہ اب زور نہیں
اس طرح آپ کا اب نام چلے گا کیوں کر

میں تو اِس حال میں بھی آپ کا دوں ساتھ مگر
معترض مجھ پہ ہُوئی جاتی ہیں اماں آپا
جانے کیا کر دیا جادُو کسی مل والے نے
اب تو ننھا بھی اُسے کہتا ہے "پاپا۔ پاپا"



آپ کی طرح کوئی میرے بدن سے کھیلے
آپ کے سر کی قسم مجھ کو نہیں ہے منظور
لیکن اب حکم بزرگوں کا میں کیسے ٹالوں
آپ غربت سے ہیں مجبور میں اُن سے مجبور





سترھواں سنگار

توڑ کے گھنگرو
چھوڑ کے محفل
چپ کا برن کیوں پہنا ہے

پیٹ پہ کھجلی
منہ پر دانے
واہ ترا کیا کہنا ہے



کیوں شرمائے
کیوں گھبرائے
یہ دُکھ ہنس کر سہنا ہے

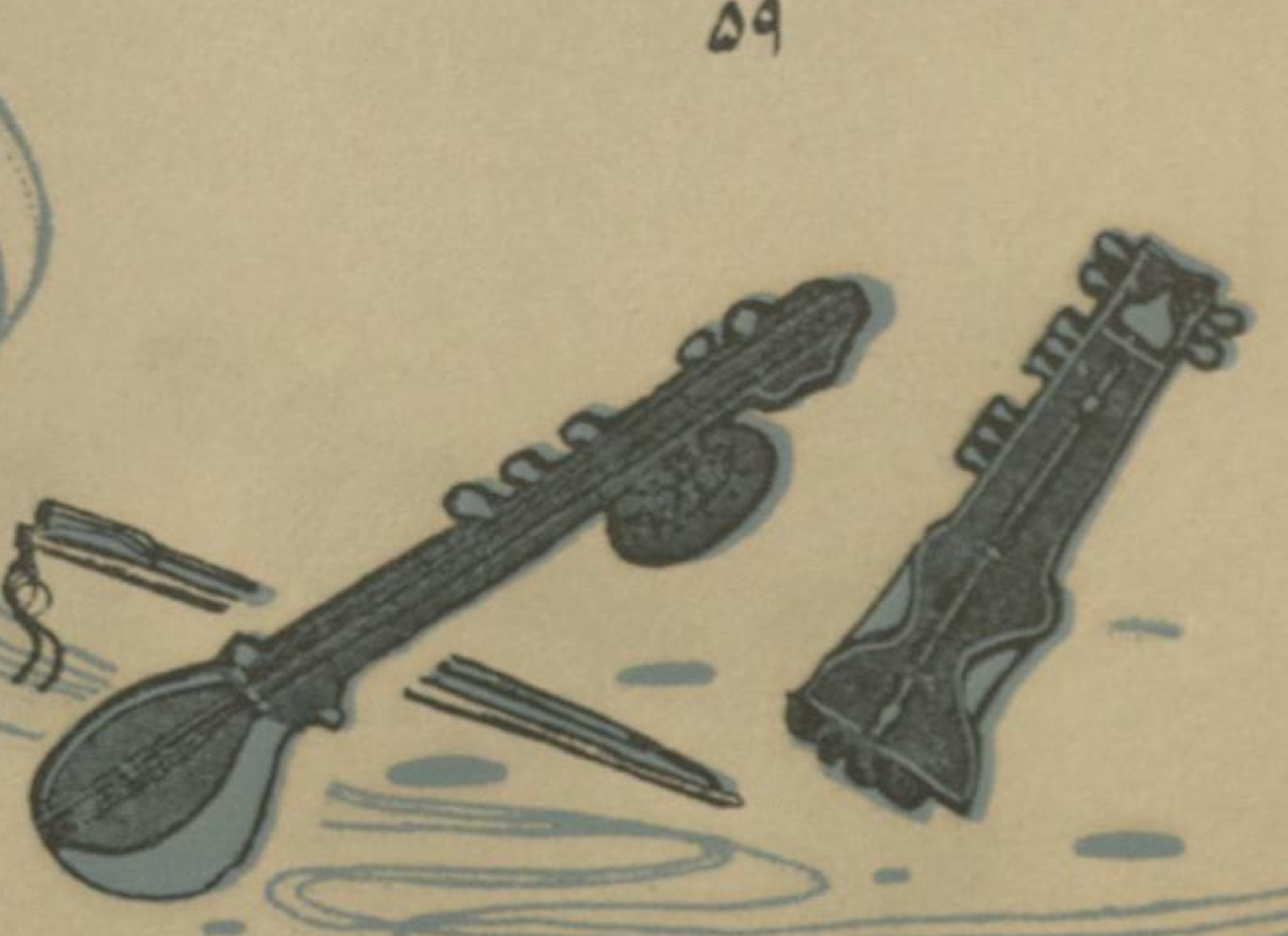
پیاری بِٹیا،
یہی مرض تو
اِس پیشے کا گہنا ہے





فن کار

مَیں نے اُس کے گیت سُنے
اُس نے مجھ کو جیت لیا
کتنی بڑی فنکار تھی وہ
مَیں نے اُس کی پُوجا کی
اور دامن جب پھیلایا
سرتاپا اِنکار تھی وہ
دھن دولت کے مندر میں
دیوی بن جانے کے بعد
پتھّر کی دیوار تھی وہ



جس جس نے چھنکائی جیب
راگ رنگ کی بولی میں
اُن سب کی غمخوار تھی وہ
اُس نے بھر لی رسوائی
اپنے فن کی جھولی میں
کتنی بڑی فنکار تھی وہ





بھُول

میں فقیرانہ ترے در پہ چلا آیا تھا
یہ سمجھ کر کہ مرے عہد کی فنکار ہے تُو

میں نے سوچا تھا کہ احساس ہے بیدار ترا
مجھ سے بس نقدِ محبّت کی طلبگار ہے تُو

مجھ کو اس بات کا خود تُو نے دلایا تھا یقیں
اپنے ماحول کے دستور سے بیزار ہے تُو

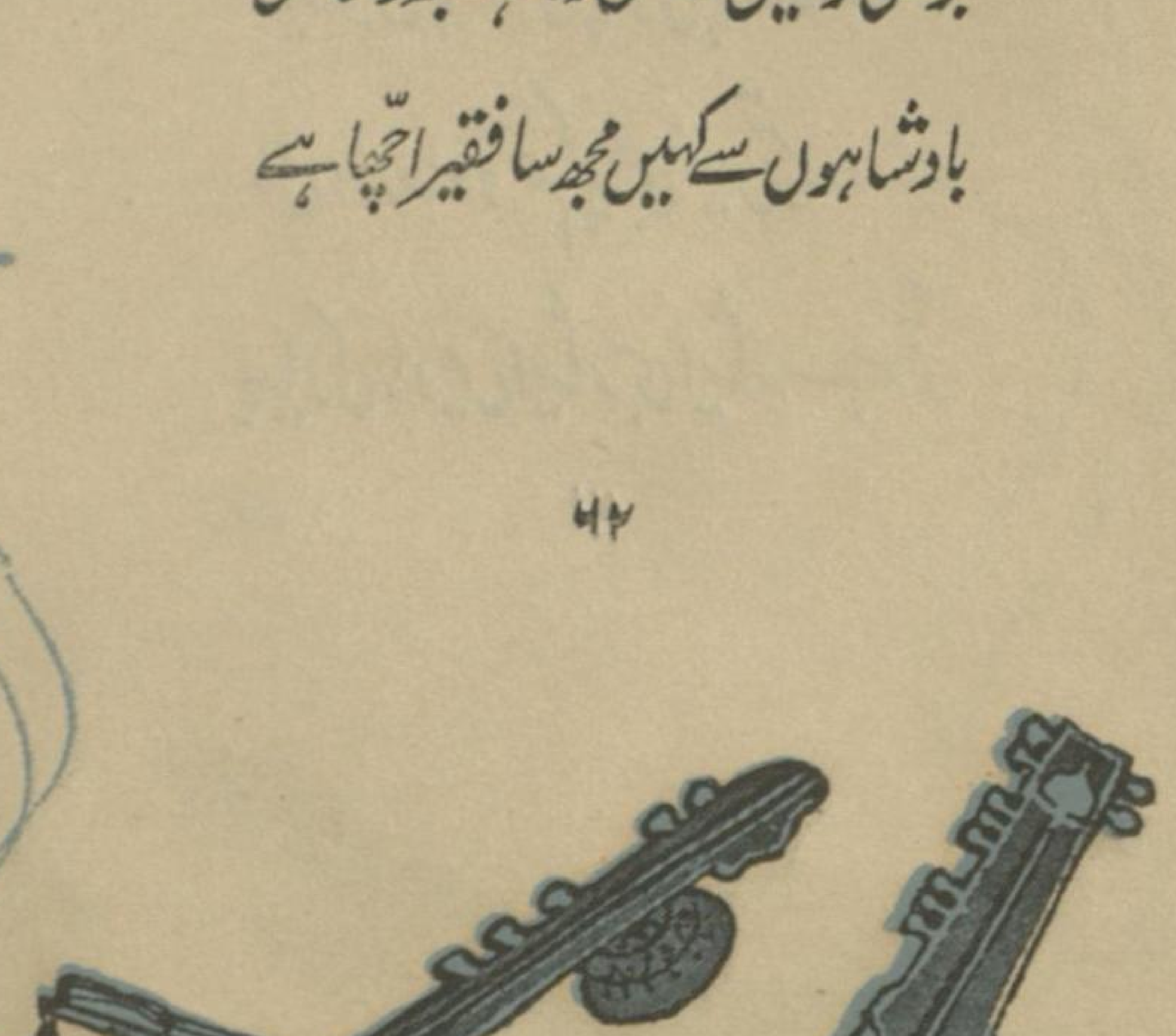
داشتاؤں کا چلن تجھ کو نہیں ہے منظور
ایک بس ایک ہی پہلو کی پرستار ہے تُو

مال و زر جاہ و حشم کچھ بھی نہیں تیرے لیے
پیار کی راہ میں ایثار ہی ایثار ہے تُو



بند ہے در ترا عیاش رئیسوں پہ مگر
میری آغوش میں ڈھل جانے کو تیار ہے تُو

میں نے سوچا تھا تری محفلِ رُسوائی میں
دل مرا کاکلِ عصیاں کا اسیر اچھا ہے
اصل میں کچھ بھی نہیں سلسلۂ نام و نسب
وہی اچّھا ہے یہاں جس کا ضمیر اچھا ہے
ایک تسکین تُو ملتی ہے ہر اک ٹیس کے ساتھ
تو نے جو مجھ پہ چلایا ہے وہ تیر اچھا ہے
جو کسی کو نہیں حاصل وہ ہے مجھ کو حاصل
بادشاہوں سے کہیں مجھ سا فقیر اچّھا ہے



آج لیکن ترے بدلے ہُوئے حالات کے ساتھ
طعنے دیتی ہے مری شانِ فقیرانہ مجھے

میں تو لے کے گیا کاسۂ معراجِ وفا
بھیک میں بھی نہ ملا پیار کا نذرانہ مجھے

بے زری جُرم ہے اِس محفلِ رسوائی میں
لاکھ سمجھاتے رہے شیشہ و پیمانہ مجھے

میں بہر حال ترے پیار کا دم بھرتا ہُوں
غور سے دیکھتی ہے جُرأتِ رندانہ مجھے

کیسے آیا مجھے مستقبلِ زرّیں کا خیال
یاد تھا جب ترے ماضی کا بھی افسانہ مجھے

آج کچھ ہوش میں آیا ہُوں تو میں سوچتا ہُوں
اب تو دیوانہ بھی کہہ سکتا ہے دیوانہ مجھے



مجبوری

میں تیرے لیے دُنیا پہ ہنسا
تو مجھ پہ ہنسی دُنیا کے لیے
اے مصلحتوں کی شہزادی
آنکھوں میں جلا کر غم کے دِیے
—— میں جاؤں کہاں ؟

تو چاہے اگر تو جانِ جہاں
میں چھوڑ کے تیری محفل کو
صحرائے ہوس تک ہو آؤں
پر تجھ سے بچھڑ کر اس دل کو
—— بہلاؤں کہاں ؟



جب میرے ہٹیلے سجدوں کو

خود تو نے دکھایا در اپنا

اُب تو ہی مجھے بتلا کہ تیرے

قدموں سے اُٹھا کر سر اپنا

——— ٹکراؤں کہاں ؟



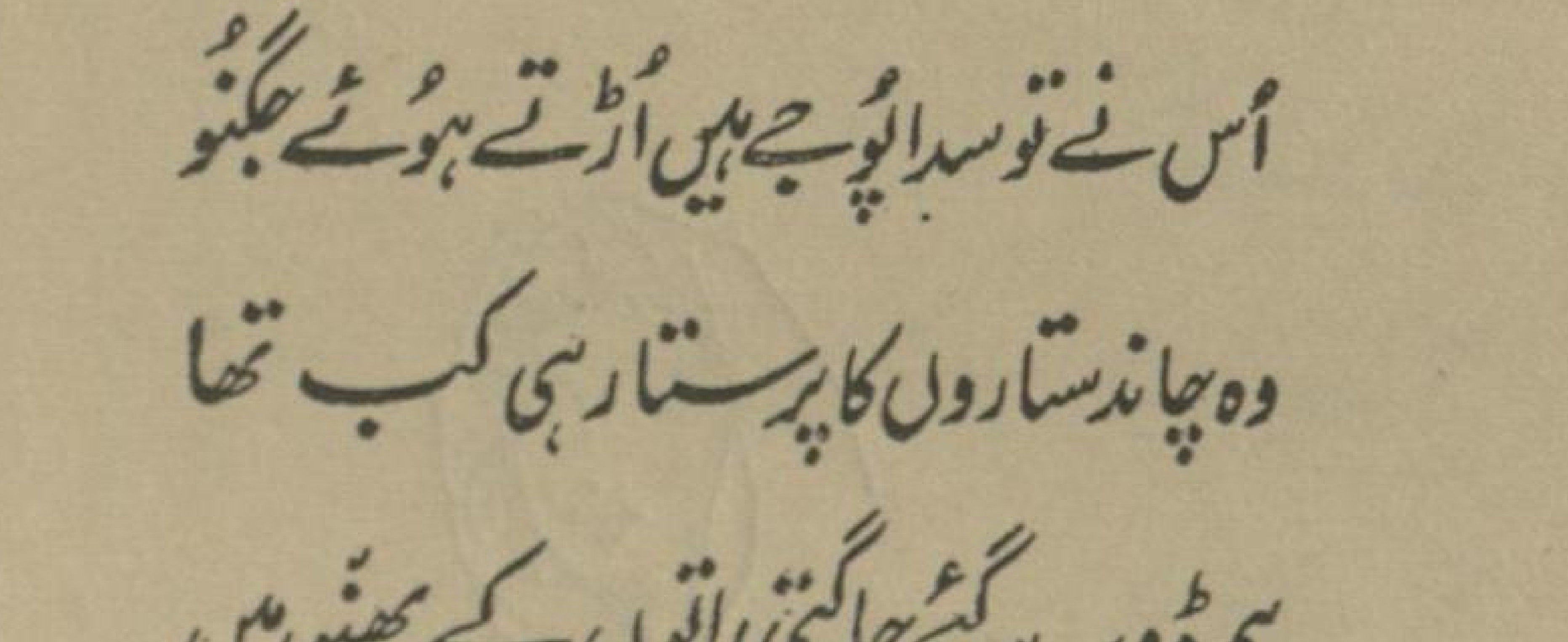


غزل

کیا اس کا گلہ کیجے اُسے پیار ہی کب تھا
وہ عہد فراموش وفادار ہی کب تھا

اُس نے تو سدا پُوجے ہیں اُڑتے ہُوئے جگنُو
وہ چاند ستاروں کا پرستار ہی کب تھا

ہم ڈوب گئے جاگتی راتوں کے بھنور میں
ہاتھ اُس کا ہمارے لیے پتوار ہی کب تھا



آموں کی حسیں رُت کے سوا بھی تو وہ کُوکے
لیکن کسی کوئل کا یہ کردار ہی کب تھا

آواز جو میں دُوں تو کسی اَور کو چھُو لے
اس آنکھ مچولی سے وہ بیزار ہی کب تھا

تم اُس کو بُرے نام سے یارو نہ پکارو
یہ نام اُسے باعثِ آزار ہی کب تھا

مشہورِ زمانہ ہیں قتیلؔ اُس کی اُڑانیں
وہ دامِ محبّت میں گرفتار ہی کب تھا





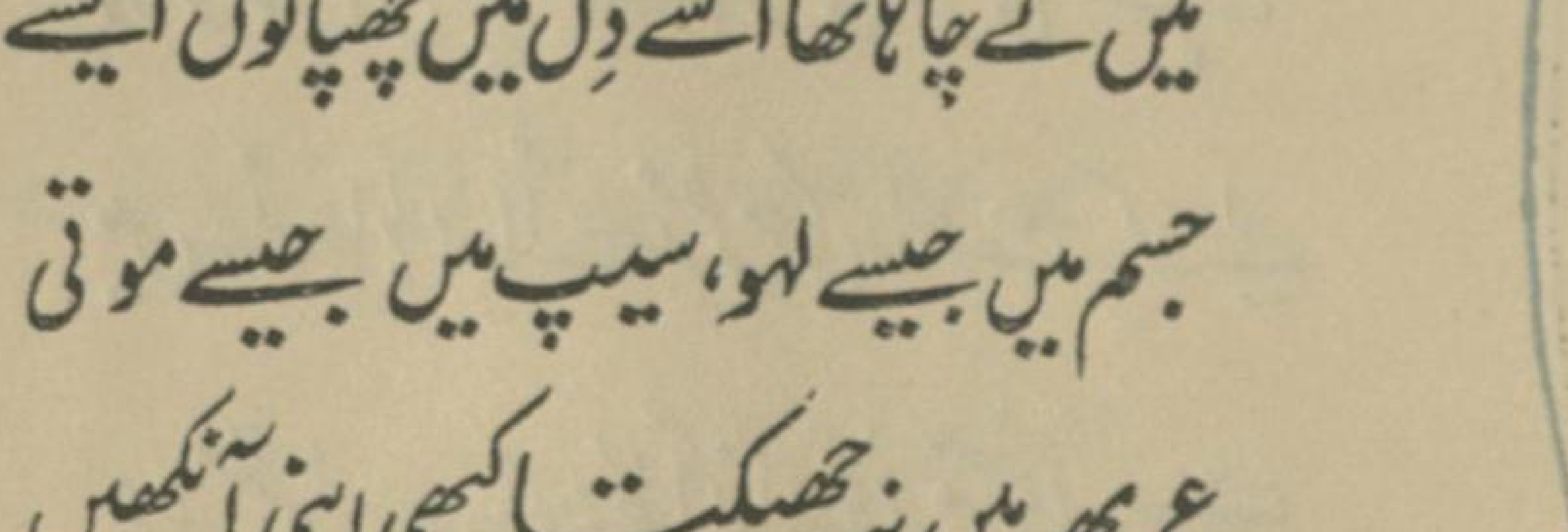
لمحوں کی پرستار

میں نے چاہا تھا اُسے رُوح کی راحت کے لیے
آج وہ جان کا آزار بنی بیٹھی ہے
میری آنکھوں نے جسے پھول سے نازک سمجھا
اب وہ چلتی ہوئی تلوار بنی بیٹھی ہے
ہمسفر بن کے جسے ناز تھا ھمراہی پر
رہزنوں کی وہ طرفدار بنی بیٹھی ہے
کسی افسانے کا کردار بنی بیٹھی ہے



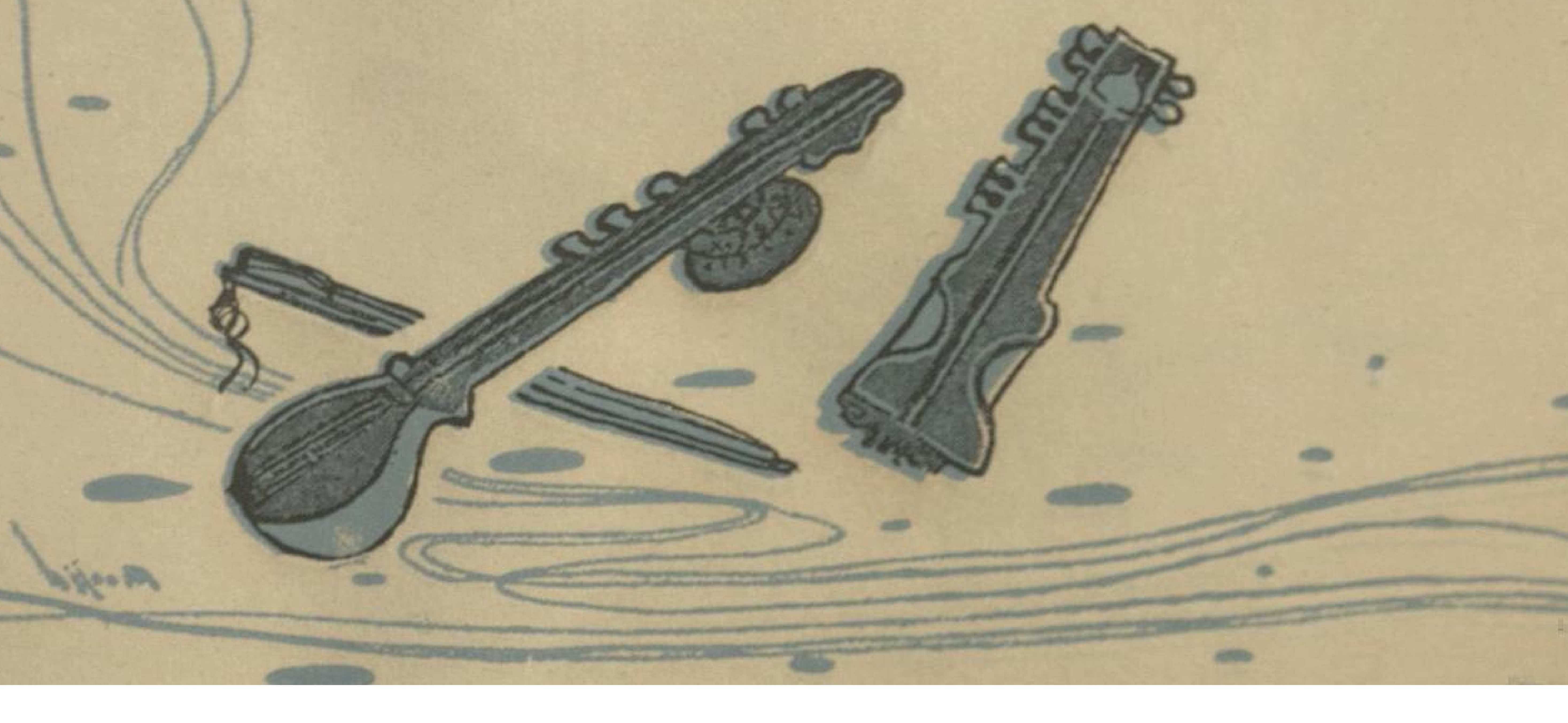
اس کی معصومیت دل پہ بھروسہ تھا مجھے
عزمِ سیتا کی قسم، عصمتِ مریم کی قسم
یاد ہیں اس کے وہ ہنستے ہوئے آنسو مجھ کو
خندۂ گل کی قسم، گریۂ شبنم کی قسم
اس نے جو کچھ بھی کہا میں نے وہی مان لیا
حکمِ حوّا کی قسم، جذبۂ آدم کی قسم
پاک تھی رُوح مری چشمۂ زمزم کی قسم

میں نے چاہا تھا اُسے دِل میں چھپالوں ایسے
جسم میں جیسے لہو، سیپ میں جیسے موتی
عمر بھر میں نہ جھپکتا کبھی اپنی آنکھیں
میرے زانو پہ وہ سر رکھ کے ہمیشہ سوتی



شمعِ یک شب تو سمجھتا ہے اُسے ایک جہاں
کاش بن جاتی وہ میرے لیے جیون جُوتی
در بدر اس کی تمازت نہ پریشاں ہوتی

میں اسے لے کے بہت دُور نکل جاؤں مگر
وہ مری راہ میں دیوار بنی بیٹھی ہے
زندگی بھر کی پرستش اُسے منظور نہیں
وہ تو لمحوں کی پرستار بنی بیٹھی ہے
میں نے چاہا تھا اُسے رُوح کی راحت کے لیے
وہ مگر جان کا آزار بنی بیٹھی ہے
کسی افسانے کا کردار بنی بیٹھی ہے



میری طرح

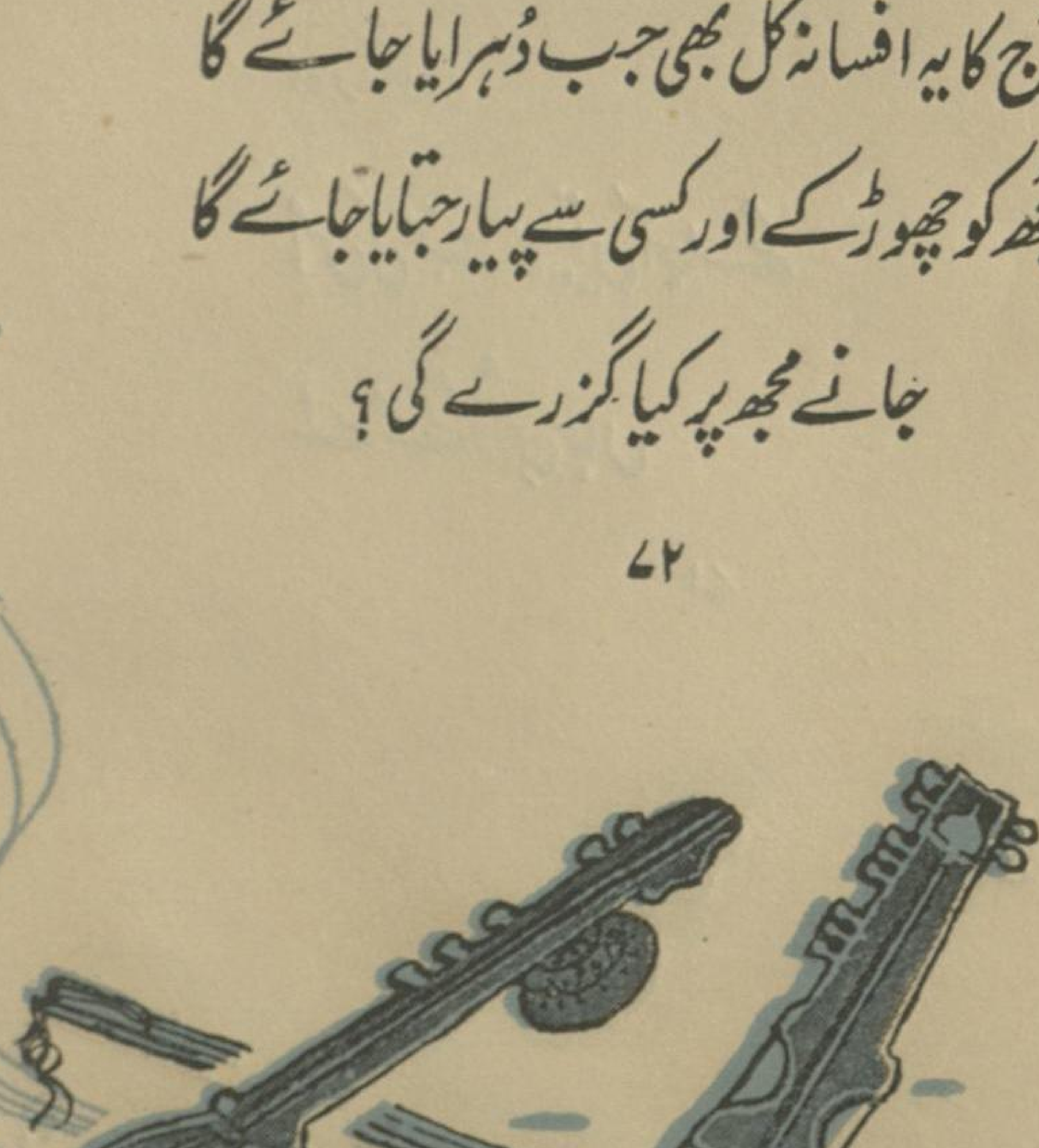
اے مرے دشمنِ جاں
میں تجھے اور تو کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن
کاش تقدیر کبھی تجھ کو دکھائے وہ دن
جب مہذّب سی طوائف کوئی
اپنے پیشے کی مذمّت کر کے
تجھ سے اظہارِ محبّت کر کے
تیرے اعصاب پہ نشّے کی طرح چھا جائے
اور تجھے
اُس کی محبّت کا یقیں آ جائے
اے مرے دُشمنِ جاں



منزل بہ منزل

جانے تجھ پر کیا گزری ہے؟
آج تیری چاہت سے جب انکار کیا ہے اُس نے
تیری وفا کو بھول کے مجھ سے پیار کیا ہے اُس نے
جانے تجھ پر کیا گزری ہے؟

جانے مجھ پر کیا گزرے گی؟
آج کا یہ افسانہ کل بھی جب دُہرایا جائے گا
مجھ کو چھوڑ کے اور کسی سے پیار جتایا جائے گا
جانے مجھ پر کیا گزرے گی؟



جانے اُس پر کیا گزرے گی

تیرے میرے بعد بھی جس کے پیار کو وہ ٹھکرائے گی

جس کی لاش پہ رکھ کر پاؤں وہ آگے بڑھ جائے گی

جانے اُس پر کیا گزرے گی —؟

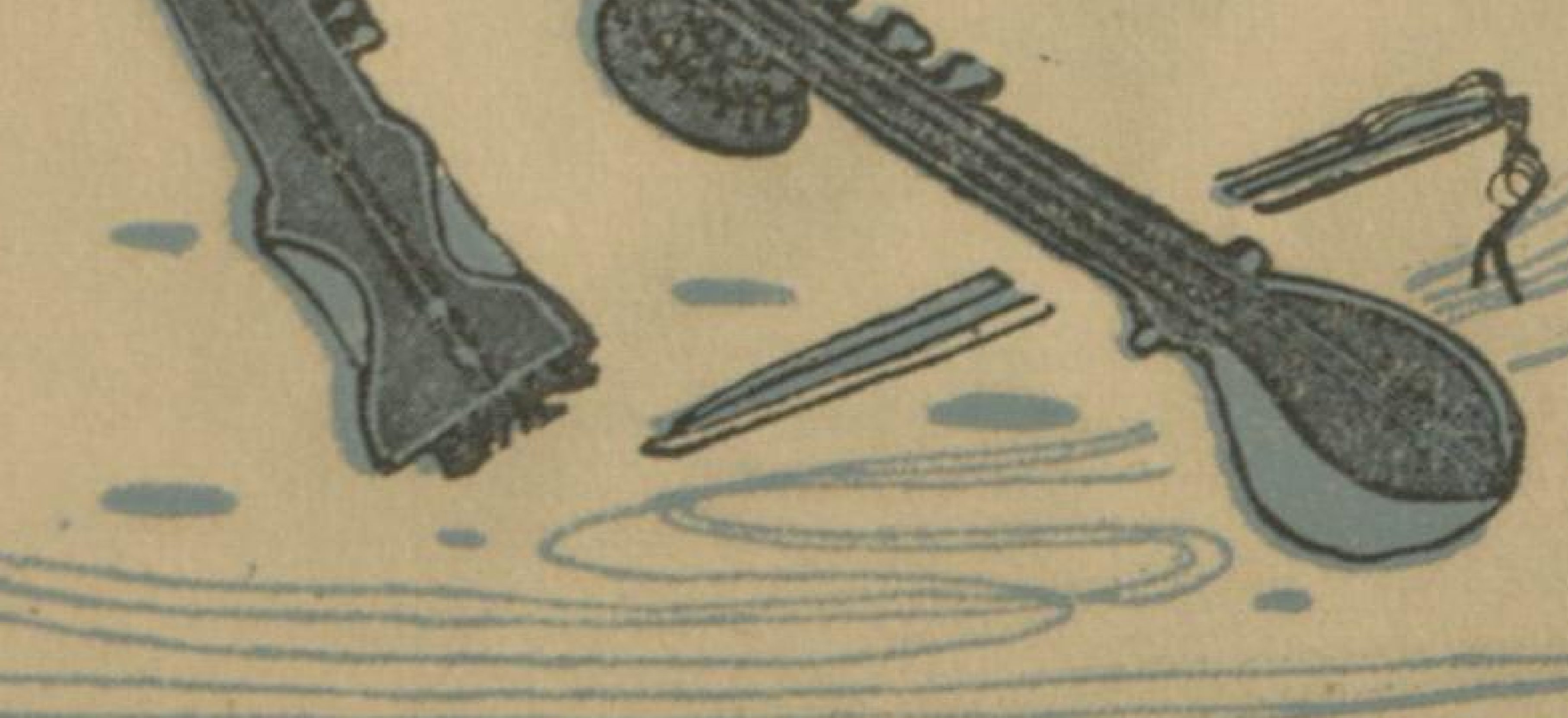




انوکھی عید

احباب پوچھتے ہیں بڑی سادگی کے ساتھ
میں اب کے سال عید مناؤں گا کس طرح؟

پہلے تو ہر برس ترے نغموں کی اوٹ سے
ہوتا رہا طلوع میرے شوق کا ہلال
میں ہر برس ترے ہی تبسّم کی چھاؤں میں
لیتا رہا شباب سے پیمانۂ جمال



تُو نے سدا کیا مجھے ممنونِ دلبری
کرتا رہا ہُوں میں بھی ادا قیمتِ وصال

بازارِ عاشقی میں وہ جنسِ نہاں تھی تو
طالب ہے کون کون؟ کسی کو پتہ نہ تھا
میں بھی تھا اک فقیر، تری زُلف کا اسیر
مجھ کو بھی تیرے پیار سے کوئی گلہ نہ تھا
کرتے ہیں جیسے اب بھی ترا اعتبار لوگ
جب بھی کسی کے ذہن پہ بارِ جفا نہ تھا

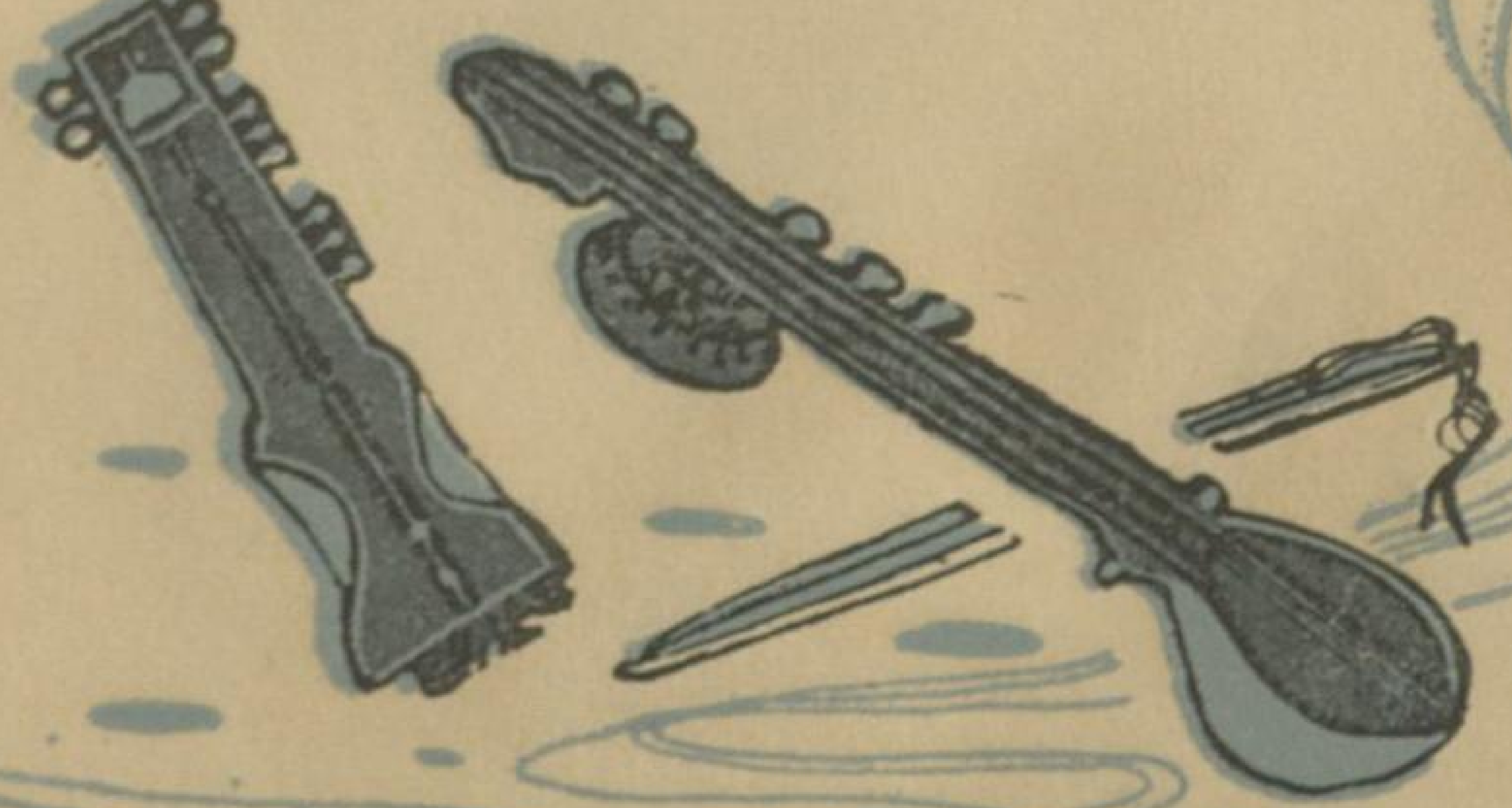
وہ تحفہ ہائے زر تجھے کیا اَب بھی یاد ہیں
میں نے کیے جو نذر بطورِ خراجِ فن



بھولا نہ ہوگا تجھ کو وہ ملبوسِ ریشمیں
سجتا رہا ہے جس سے ترا بے وفا بدن
اِس بار بھی خرید کے ایسا ہی اِک لباس
میں اپنے اعتماد کا سلواؤں گا کفن

اور دل میں حسرتوں کا بناؤں گا اِک مزار
میں اَب کے سال عید مناؤں گا اِس طرح





کس کے لیے

میں لکھوں تازہ غزل کس کے لیے ــــ؟

میرے افکار کا اب کوئی بھی دمساز نہیں

ساز موجود ہیں لیکن تیری آواز نہیں

گونج باقی ہے سو وہ پیار کی غمّاز نہیں

مطربہ! اب وہ تری سوچ کا انداز نہیں

پھر مرا جوشِ عمل کس کے لیے ــــ؟

میں لکھوں تازہ غزل کس کے لیے ــــ؟

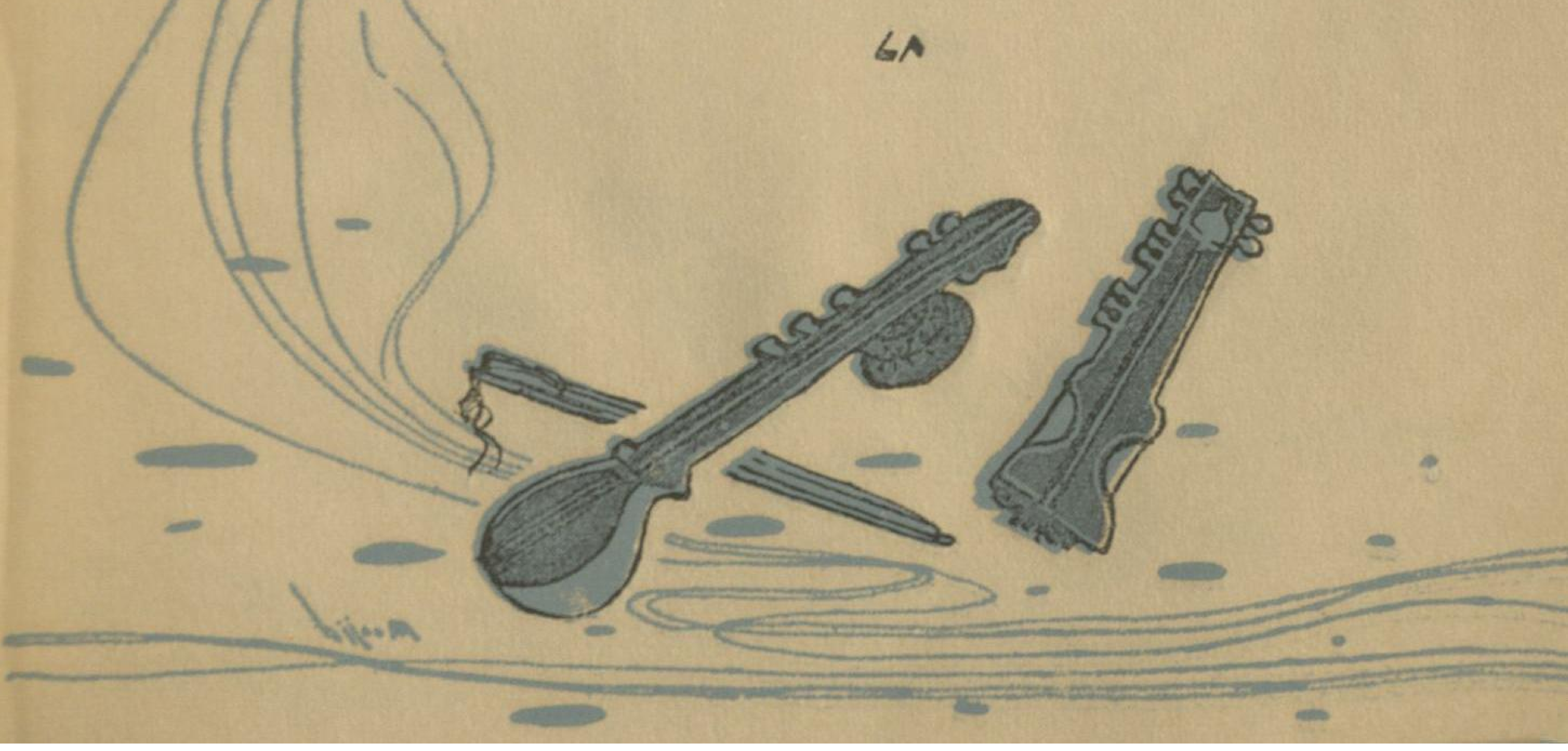


سالہا سال رہی ہے مرے شعروں کی اساس
تیرے لہجے کی گھلاوٹ، ترے ہونٹوں کی مٹھاس
تو نے پہنا دیا نغموں کو تعیّش کا لباس
اب ترے غم کے سوا کچھ بھی نہیں ہے مرے پاس

اب کھلاؤں میں کنول کس کے لیے ـــ؟
میں لکھوں تازہ غزل کس کے لیے ـــ؟

تیری آواز کا جادو تھا مرا حسنِ کلام
کر دیا تُو نے اسے کُوچہ بہ کُوچہ نیلام
دولتِ شعر و سخن لُٹ گئی آخر سرِ عام
کیوں کسی شعر کو منسوب کروں اب ترے نام

ذہن میں آئے خلل کس کے لیے ـــ؟
میں لکھوں تازہ غزل کس کے لیے ـــ؟



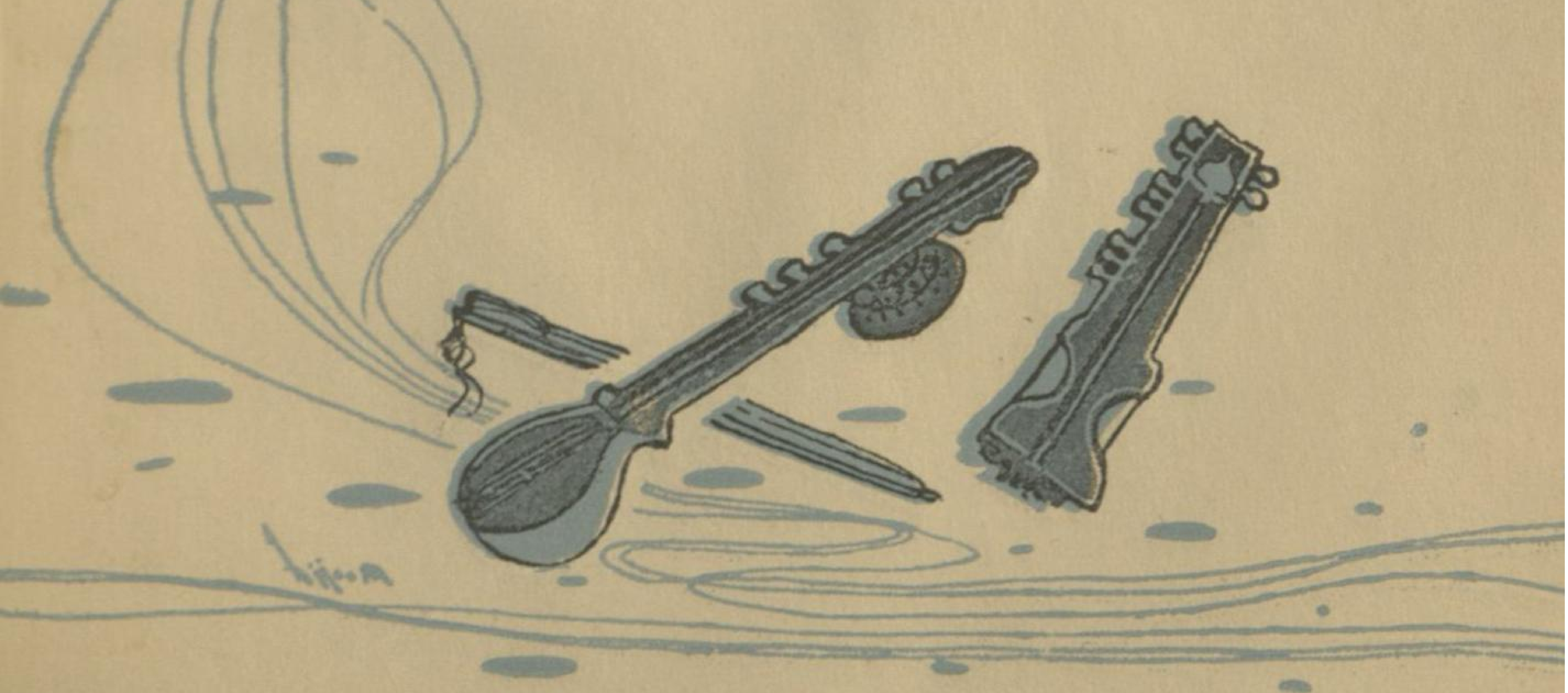
تیرے اسلاف نے کھولی تھی جو نغموں کی دکاں
اس میں اِک شاعرِ نادار کی توقیر کہاں
یہی بہتر ہے کہ خاموش رہے میری زباں
نہ تو ممتاز ہے تُو اور نہ میں شاہجہاں

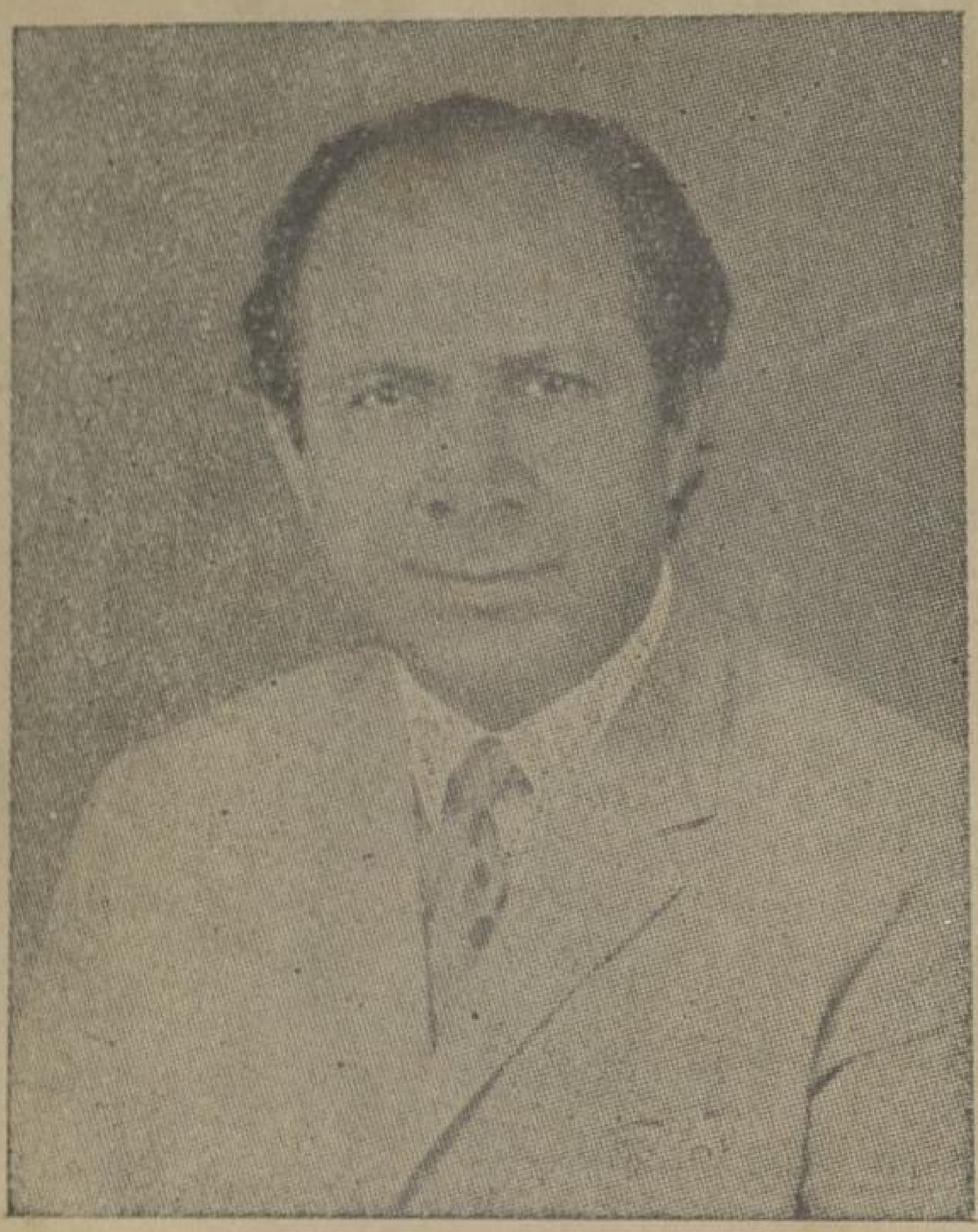
پھر کوئی تاج محل کس کے لیے ——؟
میں لکھوں تازہ غزل کس کے لیے ——؟





مطمئن کوئی نہیں ہے اِس سے
کوئی برہم ہے تو خائف کوئی
نہیں کرتی یہ کِسی سے بھی وفا
زندگی ہے کہ طوائف کوئی





قتیل شفائی

گیت کے سب سے بڑے مزاج دان ہیں۔ اور ان کے گیت اردو ادب میں ایک مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔

"جھومر"

ان کے گیتوں کا خوبصورت مجموعہ ہے جسکا دوسرا ایڈیشن ترمیم و اضافہ کے بعد ہم اس دعوے کے ساتھ پیش کر رہے ہیں کہ یہ مجموعہ حسن معنوی کے ساتھ ساتھ حسن ظاہری میں بھی ایک انوکھی سج دھج دکھائے گا

●